بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلیم کے نام خطوط

ضبطِ ولادت

(FAMILY PLANNING)

تم نے ٹھیک کہا ہے سلیم کہ آج کل دنیا میں' جس مسئلہ نے (ایٹم بم کے بعد) اقوام عالم کی توجہات کو سب سے زیادہ اپنی طرف مرکوز کر رکھا ہے وہ برتھ کنٹرول یا ضبط ولادت ہے۔ اس سے پہلے' ضبط ولادت کے آلات و ادویات یا طرق و ذرائع محض انفرادی دلچسپی کا موجب تھے لیکن اب انہوں نے اجتماعی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اسی نسبت سے اس مسئلہ کی اہمیت بھی بڑھ گئی ہے۔ اس وقت مانع حمل تدابیر بالعموم اس مقصد کے لئے استعمال کی جاتی تھیں کہ ناجائز جنسی اختلاط پر مہر تصدیق ثبت نہ ہونے پائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت یہ تدابیر بعض حالات میں جائز مقاصد کے لئے بھی استعمال کی جاتی تھیں۔ مثلاً بیوی کی صحت کے پیش نظر۔ لیکن ان کا عمومی مقصد ناجائز تعلقات کے نتائج وعواقب سے محفوظ رہنا ہی تھا۔ اب اس مسئلہ نے اور شکل اختیار کر لی ہے اور وہ یہ کہ جس رفتار سے دنیا کی آبادی بڑھ رہی ہے' زمین کی پیداوار (یعنی سامان خورونوش) میں اس نسبت سے اضافہ نہیں ہو رہا۔ نہ ہی سردست (یا یوں کہئے کہ فوری طور پر) ایسا کیا جانا ممکن ہے۔ اس لئے خدشہ یہ ہے کہ اگر صورت حالات کچھ وقت تک یہی رہی تو دنیا بھوک سے مر جائے گی۔ اس خدشہ کے پیش نظر سوچا یہ جا رہا ہے کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے آبادی کا یہ بے محابا اضافہ محدود ہو جائے۔ اسی کو خاندانی منصوبہ بندی (یا Family Planning) کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ نہ ہو کہ (جس طرح آج کل ہمارے ہاں ہو رہا ہے) ایک میاں بیوی کے ہاں جتنے بچے پیدا ہو سکتے ہیں' ہوتے چلے جائیں' بلکہ ایسا انتظام کیا جائے کہ ملک میں سامان خوراک کی نسبت سے' بچوں کی تعداد کی حد بندی ہو جائے۔

دیگر اقوام عالم اس مسئلہ پر قومی مصالح کی روشنی میں غور وفکر کر رہی ہیں۔ یعنی وہ یہ سوچتی ہیں کہ اس سوال کا قومی معیشت' ملکی سیاست اور عوام کی صحت پر کیا اثر پڑے گا لیکن تم جانتے ہو سلیم! کہ ہمیں اس پر (ان مصالح کے علاوہ) ایک اور نقطۂ نگاہ سے بھی غور کرنا ہوگا۔ یعنی یہ کہ اسلام کا اس باب میں کیا حکم ہے؟ ہمارے مذہبی طبقہ میں' اس سلسلہ میں دو گروہ سامنے آ رہے ہیں۔ ایک کا خیال ہے کہ ضبط ولادت بالکل جائز ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ قطعاً ناجائز ہے۔ اس حد تک ناجائز کہ

> ایسی کوئی تحریک اگر آنحضرتؐ کے سامنے اٹھتی تو مجھے یقین ہے کہ آپ اس پر لعنت بھیجتے اور اس کے خلاف ایسا ہی جہاد کرتے جیسا شرک و بت پرستی کے خلاف آپؐ نے کیا۔ (ترجمان القرآن بابت اپریل ۱۹۶۰ء سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)۔

جو گروہ ضبط ولادت کو جائز قرار دیتا ہے وہ اپنے خیال کی تائید میں ان احادیث کو پیش کرتا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ نبی اکرمؐ نے عزل [1] کی اجازت دی تھی۔ دوسرا گروہ ان احادیث کی صحت سے تو انکار نہیں کرتا لیکن کہتا یہ ہے کہ

عزل کی اجازت میں جو چند روایات مروی ہیں ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنے ذاتی حالات یا مجبوریاں بیان کیں اور آنحضرتؐ نے انہیں سامنے رکھ کر کوئی مناسب جواب دے دیا۔ اس طرح کے جو جوابات نبیؐ سے حدیث میں منقول ہیں ان سے اگر عزل کا جواز نکلتا بھی ہے تو وہ ہرگز ضبط ولادت کی اس عام تحریک کے حق میں استعمال نہیں کیا جا سکتا جس کی پشت پر ایک باقاعدہ خالص مادہ پرستانہ اور اباحت پسندانہ فلسفہ کارفرما ہے۔ (ایضاً)

لیکن سلیم! میں کہتا ہوں کہ عزل سے متعلق روایات سے اس مسئلہ کے جواز یا عدم جواز کی سند پیش کرنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ اس لئے کہ یہ روایات پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ نبی اکرمؐ کی ذات اقدس واطہر کی طرف ان کی نسبت کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوسکتی۔ یعنی ان روایات کا مضمون بتا رہا ہے کہ یہ وضعی ہیں۔ حضورؐ نے ایسا کبھی نہیں فرمایا ہوگا۔ عزل سے متعلق بخاری کی ایک روایت میں ہے:-

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک دن وہ نبیؐ کے پاس بیٹھے تھے تو انہوں نے کہا کہ ہم (جہاد میں) قید کی ہوئی لونڈیوں سے جماع کرتے ہیں۔ چونکہ ہم ان کو بیچنا چاہتے ہیں (اس لئے یہ نہیں چاہتے کہ وہ حاملہ ہو جائیں) پس آپ عزل کی نسبت کیا رائے دیتے ہیں۔ حضرتؐ نے فرمایا کہ تم لوگ ایسا کرتے ہو؟ تم کو کچھ مجبوری نہیں ہے اگر تم ایسا نہ کرو اس لئے کہ جس جان کا پیدا کرنا اللہ نے مقدر کر دیا وہ ضرور پیدا ہوگی۔ 2

دوسری روایت ہے کہ

ابن محیریز کہتے ہیں کہ میں نے ابوسعید کو دیکھا ہے اور میں نے ان سے (کچھ) دریافت کیا تھا تو انہوں نے کہا کہ غزوہ بنی مصطلق میں ہم نبیؐ کے ہمراہ گئے تو ہم نے عرب کے قیدیوں میں سے کچھ قیدیوں کو پایا۔ پھر ہمیں عورتوں کی خواہش ہوئی اور تجرد نے ہم پر غلبہ پالیا تو ہم نے عزل کی خواہش کی۔ پس ہم نے رسولؐ خدا سے اس کے بارے میں پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا اگر تم یہ نہ کرو تو تم کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ کیونکہ قیامت تک جو جان پیدا ہونے والی ہے وہ تو ضرور پیدا ہوگی۔ 3

یہ روایات کسی تبصرہ' اور اپنے وضعی ہونے کے لئے' کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ میرے نزدیک انہیں نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کرنا بہت بڑی جسارت اور حضورؐ کی شان اقدس میں انتہائی سوءادبی ہے۔

مذہبی طبقہ کی طرف سے ضبط ولادت کے خلاف جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ اس نوعیت کے ہیں کہ:-

(۱) اس سے حرامکاری کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

(۲) یہ قتل اولاد ہے جو اسلام میں بہت بڑا جرم ہے۔

(۳) بھوک کے خوف سے ایسا کرنا' خدا کی رزاقیت پر ایمان کے منافی ہے۔

قبل اس کے کہ سوال (ضبط ولادت) کے متعلق قرآنی نقطہ نگاہ سے گفتگو کی جائے' مختصر طور پر مندرجہ بالا اعتراضات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

سب سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس سے حرامکاری کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اول تو یہ دیکھو سلیم! یہ اعتراض ''ضبط ولادت'' کے خلاف نہیں بلکہ ان تدابیر کے خلاف ہے جو عام طور پر اس مقصد کے لئے اختیار کی جاتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ضبط ولادت کا مسلک اختیار کرتا ہے لیکن حرامکاری سے بچا رہتا ہے' تو اس کا یہ مسلک اسلامی نقطہ نگاہ سے کیسا ہوگا۔ اگر یہ مسلک جائز ہوگا تو پھر ضبط ولادت کے خلاف کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ اعتراض ان تدابیر کے خلاف

ہونا چاہئے جن سے حرامکاری کے پھیلنے کا اندیشہ ہو اور اگر ضبط ولادت' بہرحال ناجائز ہے تو پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ اس کے لئے ذرائع کس قسم کے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اگر ضبط ولادت ناجائز نہیں' اور ملک کے اجتماعی مصالح کے پیش نظر اس کا اختیار کیا جانا ضروری ہے تو پھر سوچنا یہ چاہئے کہ

(i) اس کے لئے ذرائع ایسے اختیار کئے جائیں جو حرامکاری پھیلانے کا سبب نہ بن سکیں اور

(ii) اگر سردست ایسے ذرائع میسر نہیں آ سکتے' تو ایسی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن سے لوگ ان ذرائع کا ناجائز استعمال نہ کریں۔

یہ دلیل کہ چونکہ لوگ ان ذرائع کا غلط استعمال کریں گے اس لئے اصل مقصد ہی کو ختم کر دینا چاہئے' جس قسم کا وزن رکھتی ہے' اہل علم و دانش کے لئے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے (مثلاً) یہ تجویز کیا جائے کہ چونکہ لوگ بلا ٹکٹ سفر کرتے ہیں اس لئے ریلوں کو بند کر دیا جائے۔ یا عورتیں مٹی کا تیل کپڑوں پر چھڑک کر خودکشی کر لیتی ہیں' اس لئے مٹی کے تیل کا استعمال (بلکہ یوں کہئے کہ ماچس کا استعمال) ممنوع قرار دے دیا جائے۔ یا ملک میں آئے دن چاقو چلنے کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں اس لئے چاقو بننے بند کر دینے چاہئیں۔ حتیٰ کہ اس دلیل کو اور آگے بڑھایا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ حرامکاری بہرحال عورتوں کی موجودگی سے ہوتی ہے اس لئے حرامکاری کو بند کرنے کے لئے تمام عورتوں کو ملک بدر کر دیا جائے!

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے' اگر ضبط ولادت فی نفسہٖ ناجائز نہیں' تو ہمارے لئے سوچنے کی بات صرف یہ ہوگی کہ اس مقصد کے حصول کے لئے ذرائع کیا اختیار کئے جائیں اور وہ کون سی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے ان ذرائع کا غلط استعمال نہ ہو۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ ''قتل اولاد'' ہے۔ یعنی اگر جنسی اختلاط کیا جائے اور حمل قرار نہ پانے دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی اولاد کو قتل کرتے ہیں۔ یہ اعتراض بے حد کمزور ہے اولاً یہ کہ جو بچہ وجود ہی میں نہیں آیا اسے قتل کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ انسان کے مادۂ تولید میں بچہ بن جانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اگر استقرار حمل روک دیا جائے تو وہ صلاحیت محسوس پیکر اختیار نہیں کرتی اس لئے یہ قتل اولاد ہے۔ تو اس دلیل کا بودا پن واضح ہے۔ مثلاً

(۱) اگر ایک شخص جوان ہونے کے باوجود' نکاح نہیں کرتا۔ یا دیر میں نکاح کرتا ہے تو اسے بھی قتل اولاد کا مرتکب قرار پا جانا چاہئے۔ اس لئے کہ اس نے اپنے اس عمل سے' نہ معلوم کتنے بچوں کو وجود میں آنے سے روک دیا!

(۲) مادہ تولید کے ایک قطرہ میں کروڑوں نہیں تو لاکھوں جرثومے ہوتے ہیں جن میں سے ہر جرثومہ میں بچہ بن جانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اول تو یہ بھی نہیں ہوتا کہ ہر جنسی اختلاط پر بالضرور حمل قرار پا جائے۔ اس صورت میں' ہر اختلاط سے لاکھوں بچے قتل ہو جاتے ہیں۔ اور جب حمل قرار پا جائے تو' ان لاکھوں جرثوموں میں سے' صرف ایک جرثومہ بچہ کی صورت اختیار کرتا ہے۔ (یا زیادہ سے زیادہ دو تین جرثومے)۔ باقی تمام جرثومے ضائع چلے جاتے ہیں۔ ان جرثوموں کو بھی ہلاک شدہ اولاد تصور کرنا چاہئے۔

(۳) استقرار حمل کے بعد جنسی اختلاط تو بہرحال قتل اولاد قرار پا جائے گا۔ کیونکہ اس کے بعد تمام جرثومے ضائع ہو جاتے ہیں۔ نیز اگر میاں بیوی میں سے کوئی عقیم (بانجھ) ہو تو فریق ثانی کے تمام حیات آور جرثومے مستقلاً ضائع ہو جاتے ہیں۔ کیا اسے بھی قتل اولاد تصور کیا جائے گا۔

ان اعتراض کرنے والوں کی کوتاہ نظری پر غور کرو۔

یہ لوگ ان بچوں کے ''قتل'' پر تو ماتم کرتے ہیں جو وجود ہی میں نہیں آتے لیکن ان بچوں کی طرف ان کی نگاہ قطعاً نہیں اٹھتی جو (غذا کی کمی کی وجہ سے) کمزور پیدا ہوتے ہیں۔ کیڑے مکوڑوں کی طرح گلیوں کی گندی نالیوں میں رینگتے پھرتے ہیں اور طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔ یہ محض اس لئے ہوتا ہے کہ ان کی پرورش اور خوراک کا مناسب انتظام نہیں ہو سکتا۔ یہ حضرات بچوں کے اس طرح قتل کو تو قابل اعتراض نہیں سمجھتے لیکن بچوں کو وجود میں نہ لانے کو جرم عظیم قرار دیتے ہیں۔ اگر اتنے ہی بچے پیدا ہوں جتنوں کی عمدہ پرورش ہو سکے تو اس طرح بچوں کا قتل واقع ہی نہ ہو۔

اب تیسرے اعتراض کو لو۔ یعنی یہ کہ بچوں کی پیدائش پر حد بندی کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اللہ کی رزاقیت پر ایمان نہیں۔ یہ سوال نسبتاً تفصیلی گفتگو چاہتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقھم وایاکم۔ (۱۷/۳۱، ۶/۱۵۲) ''اور تم اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔'' اس سے بھی وسیع مفہوم میں دوسرے مقام پر ہے۔ وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا (۱۱/۶) ''زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو''۔ ان اور انہی جیسی دیگر آیات کو اس خیال کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے کہ جب رزق کا ذمہ اللہ نے لے رکھا ہے تو پھر اس خیال سے' کہ اگر آبادی زیادہ ہو گئی تو انہیں کھانے کو نہیں ملے گا' پیدائش پر تحدید خدا کی رزاقیت پر ایمان کے منافی ہے۔ ان آیات کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس کی بابت میں تمہیں شرح وبسط سے متعدد بار لکھ چکا ہوں۔ اس لئے اس کا بار بار دہرانا ضروری نہیں۔ تم اس مقام پر صرف یہ دیکھو کہ جو مطلب ہمارا مذہب پرست طبقہ لیتا ہے' اس کا عملی نتیجہ کیا ہے۔ مثلاً

(۱) یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی (کم از کم) آدھی آبادی ایسی ہے جسے دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا اور جب قحط پڑتا ہے تو لاکھوں افراد بھوک سے مر جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب تمام مخلوق کے رزق کی ذمہ داری خدا نے لے رکھی ہے تو اس قدر مخلوق خالی پیٹ کیوں سوتی ہے اور اتنی آبادی بھوک سے کیوں مر جاتی ہے؟

(۲) کہا جائے گا کہ یہ لوگ حصول رزق کے لئے کوشش نہیں کرتے۔ لیکن یہ بھی غلط ہے۔ قحط کے زمانے میں ہزار کوشش کے باوجود کچھ نہیں ملتا اور عام حالات میں بھی کیفیت یہ ہے کہ (مثلاً) ایک مزدور دن بھر محنت کرتا ہے۔ شام کو اسے دو روپے ملتے ہیں۔ اس کی ایک بیوی اور آٹھ بچے ہیں۔ دو روپے میں اتنا آٹا نہیں ملتا جس سے ان افراد خاندان کا دو وقت پیٹ بھر سکے۔ اس لئے انہیں ایک وقت فاقہ کرنا پڑتا ہے۔

(۳) اس پر یہ لوگ کہہ دیں گے کہ یہ ملک کا غلط معاشی نظام ہے جس کی وجہ سے اس مزدور کو اتنا نہیں ملتا جس سے اس کا اور اس کے بیوی بچوں کا پیٹ بھر سکے۔ اسے اجرت اتنی ملنی چاہئے جس میں اس کا گزارہ ہو جائے۔

لیکن یہ کہنے سے یہ حضرات نہیں سوچتے کہ اس سے یہ خود ''خدا کی رزاقیت'' سے نیچے اتر کر' انسانوں کے معاشی نظام کی طرف آ جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ چیز خدا کی رزاقیت پر ایمان کے منافی نہیں؟ ان حضرات کے مسلک کی رو سے یہ چیز یقیناً خدا کی رزاقیت پر ایمان کے منافی ہے۔ لیکن تم جب ان آیات کے صحیح مفہوم کو سامنے لاؤ گے تو اس نتیجہ پر پہنچ جاؤ گے کہ یہ چیز خدا کی رزاقیت کے منافی نہیں۔ ان آیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ ملک کا معاشی نظام ایسا ہونا چاہئے جو خدا کی اس ذمہ داری کو اپنے اوپر لے لے اور افراد مملکت کو اطمینان دلا دے کہ ان کے رزق کی ذمہ داری مملکت کے سر ہے۔

اب ایک قدم آگے بڑھو! اگر صورت حالات ایسی

ہو کہ' مملکت کی تمام کوششوں کے باوجود' ملک میں اتنی پیداوار نہ ہو سکے جس سے تمام آبادی کو ضرورت کے مطابق رزق مل سکے اور مملکت کے پاس اتنے ذرائع بھی نہ ہوں کہ باقی ماندہ ضرورت پوری کرنے کے لئے باہر سے غلہ منگا سکے' اور اس کے ساتھ ہی ملک کی آبادی میں بے محابا اضافہ ہوتا جا رہا ہو تو ایسی صورت میں وہ مملکت کیا کرے؟ کیا ایسی صورت میں یہ بہتر ہو گا کہ آبادی بے حد و نہایت بڑھتی اور بھوک سے مرتی جائے یا یہ کہ آبادی کے بڑھنے کی حد بندی کر دی جائے تا کہ لوگوں کو بافراط رزق مل جائے؟ ہمارا مذہب پرست طبقہ کہتا ہے کہ پہلی صورت اسلام کی تعلیم اور منشائے خداوندی کے مطابق ہے اور دوسری شکل شریعت کی رو سے ناجائز۔ اس میں کلام نہیں کہ بہترین شکل یہ ہو گی کہ ملک کی آبادی کی نسبت سے پیداوار بڑھائی جائے' لیکن میں اسے پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ اگر صورت ایسی پیدا ہو جائے کہ پوری کوشش کے باوجود' ملک کی پیداوار' آبادی کی بڑھتی ہوئی رفتار کا ساتھ نہ دے سکے' تو اس وقت کیا کیا جائے؟

ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ اگر تمام دنیا کی پیداوار اور آبادی کو سامنے رکھا جائے تو پیداوار ضرورت سے کم نہیں ہو گی۔ سو اول تو یہ گفتگو محض قیاسی ہے۔ اعداد و شمار پر مبنی نہیں۔ (بلکہ جس قدر اعداد و شمار مہیا ہو سکتے ہیں وہ اس مفروضہ کے خلاف جاتے ہیں) لیکن دنیا آج کل جس طرح اقوام کے دائروں میں بٹی ہوئی ہے' اس کے پیش نظر' ہر قوم کی اپنی اپنی ضرورت اور اسے پورا کرنے کے اپنے اپنے ذرائع ہیں۔ جن اقوام کے پاس فاضلہ پیداوار ہوتی ہے وہ' اس کی قیمت وصول کئے بغیر' دوسری اقوام کو نہیں دیتیں اور اس کی قیمت میں جو کچھ دینا پڑتا ہے' وہ سب کو معلوم ہے۔ اس لئے سردست ساری دنیا کی پیداوار اور آبادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب' قرآنی تصور کے مطابق' تمام نوع انسان ایک عالمگیر برادری کی شکل اختیار کر لے گی اور ''ما فی السموٰت والارض'' انسان کے زیر تسخیر آ جائے گا' اس وقت رزق کی کمی کا مسئلہ باقی نہیں رہے گا۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ بحالات موجودہ اس کا کیا حل ہے؟

آؤ اب دیکھیں کہ ''ضبط ولادت'' کے معاملہ میں قرآن کریم سے ہمیں کیا راہنمائی ملتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ سمجھ لو سلیم! کہ قرآن کریم نے کہیں یہ نہیں کہا کہ تم ساری عمر بچے پیدا کرتے رہو اور اگر کسی نے اس میں کوتاہی کی' یا ایک حد تک پہنچ کر رک گیا' تو قیامت میں اس سے باز پرس کی جائے گی۔ انسان میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے لیکن جس طرح دیگر صلاحیتوں اور قوتوں کو بہرحال عندالضرورت استعمال کیا جاتا ہے' اسی طرح اسے بھی ضرورت کے مطابق استعمال کیا جائے گا۔ اگر کسی کے بازوؤں میں قوت ہے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ وہ ہر وقت ضرورتاً یا بلا ضرورت اس قوت کو استعمال کرتا رہے۔ اسے بہرحال عندالضرورت ہی استعمال کیا جائے گا۔ یہی کیفیت دیگر صلاحیتوں اور قوتوں کی ہے۔ ان کا بلاضرورت استعمال اسراف و تبذیر ہے جس کی قرآن کریم میں سخت ممانعت آئی ہے۔ لہٰذا اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کو اس وقت بروئے کار لانا چاہئے جس وقت اولاد پیدا کرنے کی ضرورت ہو۔ اب رہا اولاد کی ضرورت کا سوال! سو اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم نے بیوی بچوں کی محبت کو وجۂ جاذبیت بتایا ہے (وہ رہبانیت کی زندگی بسر کرنا نہیں سکھاتا) لیکن اس نے یہ کہیں نہیں کہا کہ اولاد پیدا کرنے کا سلسلہ متواتر جاری رکھو۔ یعنی جب ایک بچہ پیدا ہو جائے تو دوسرے بچے کی پیدائش کی بنیاد فوراً رکھ دو۔ بچوں کو عندالضرورت پیدا کرنا ہی اس صلاحیت کا صحیح استعمال ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت کا یہی مفہوم ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ نسائکم حرث لکم فاتوا حرثکم انی شئتم (۲/۲۲۳)۔ ''تمہاری

عورتیں تمہارے لئے کھیتی (کے بمنزلہ) ہیں۔ سوتم اپنی کھیتی میں جب چاہے آؤ۔'' کھیتی کی تشبیہہ سے یہ کہنا مقصود ہے کہ عورتیں اولاد کی پیدائش کا ذریعہ ہیں اور ''جب چاہو'' سے مراد یہ ہے کہ جس طرح کھیت میں عندالضرورت فصل اگائی جاتی ہے۔ اسی طرح اولاد بھی عندالضرورت پیدا کی جائے گی۔ مثلاً کھانے پینے کے معاملہ میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ فکلوا منھا حیث شئتم رغدا (۲/۵۸)۔ ''تم اس سے جب جی چاہے بافراغت کھاؤ۔'' ظاہر ہے کہ اس سے مراد ''عندالضرورت کھانا'' ہی ہے نہ کہ ہر وقت کھاتے رہنا۔ (اس نکتہ کی مزید وضاحت آگے چل کر آئے گی)۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے یہ کہیں نہیں کہا کہ تم مسلسل بچے پیدا کرتے رہو۔ نہ ہی فطرت نے انسان کو حیوانوں کی طرح مجبور کیا ہے کہ ایک وقت کے بعد اسے ضرور بچہ پیدا کرنا ہوگا۔ انسان کے ہاں بچے عندالضرورت پیدا کئے جائیں گے۔ اسی کو خاندانی منصوبہ بندی یا (Family Planning) کہتے ہیں۔ اگر بیوی کی صحت خراب ہے تو آپ کو کوئی مجبور نہیں کرتا کہ آپ ضرور بچہ پیدا کریں۔ اگر (موجودہ معاشی نظام میں) آپ کی آمدنی اتنی نہیں کہ آپ زیادہ بچوں کی کفالت کرسکیں تو آپ بچوں کی تعداد پر خود حد بندی عائد کرسکتے ہیں۔ یہ انفرادی مثالیں ہیں۔ اگر اجتماعی مصالح کا تقاضا ہے کہ ملک میں زیادہ بچے پیدا نہ ہوں تو افزائش نسل کی تحدید کی جاسکتی ہے۔ اگر اجتماعی مصالح کی خاطر' خوراک کا راشن کیا جاسکتا ہے (اور راشن اس کے سوا اور کیا ہے کہ خوراک کی حد بندی کردی جاتی ہے) اگر جانوروں کی کمی کی وجہ سے ہفتہ میں دو دن گوشت کا ناغہ کیا جاسکتا ہے تو اس قسم کے ہنگامی حالات میں بچوں کی تعداد پر حد بندی کیوں نہیں عائد کی جاسکتی؟ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے ایک شخص کے انفرادی ذوق کو ٹھیس لگتی ہے (یعنی اس کا جی چاہتا ہے کہ اس کے ہاں زیادہ بچے ہوں)۔ لیکن اجتماعی مصالح کی خاطر' انفرادی ذوق کا کسی حد تک ایثار کرنا ہی پڑتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں کہ ہفتہ بھر کے راشن کی شکر' ان کے ایک دن کے ذوق کی تسکین بھی نہیں کرسکتی۔ لیکن اجتماعی ضرورت کے لئے انہیں راشن قبول کرنا پڑتا ہے۔ البتہ مستثنیات کی ہر قانون اور قاعدے میں رعایت رکھی جاتی ہے۔

میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستان میں ضبط ولادت (یا خاندانی منصوبہ بندی) کی سکیم بالضرور نافذ ہونی چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمام حالات کا جائزہ لینے اور زمین کی پیداوار بڑھانے کے لئے پوری پوری کوشش کے بعد بھی حالات ایسے ہوں جن میں آبادی کی تحدید ناگزیر ہو جائے' تو اس صورت میں اس قسم کا اقدام' قرآنی تعلیم کے خلاف نہیں ہو گا۔

اب میں اس سوال کی طرف آتا ہوں کہ اس کے لئے (عندالضرورت) ذرائع کیا اختیار کئے جائیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور گہری توجہ کا محتاج۔ اس لئے کہ اس میں بنیادی نکتہ ایسا ہے جو شاید تمہارے سامنے پہلی مرتبہ آئے اور چونکہ وہ ہمارے عام تصور اور دنیا و جہان کی روش کے خلاف دکھائی دے گا' اس لئے اگر تم نے اسے سطحی نظر سے دیکھا تو بات کی تہہ تک پہنچنا مشکل ہوگا۔

ہمارے ہاں ازدواجی زندگی کا بنیادی مقصد' جنسی اختلاط ہوتا ہے۔ 4 باقی مقاصد ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے اس کا بنیادی مقصد' رفاقت۔۔۔ (Companionship) ہے (زوج کا مفہوم ہی یہ ہے)۔ وہ واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ و رحمۃ ان فی ذالک لایات لقوم یتفکرون (۳۰/۲۱)۔ ''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے خود تم میں سے تمہاری ازواج پیدا

کیں تا کہ تمہیں ان سے سکون حاصل ہو اور اس نے تم میں محبت اور رحمت پیدا کی۔ یقیناً اس حقیقت میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔'' یعنی محض جذباتی نگاہ سے دیکھو تو سلسلۂ ازدواج جنسی جذبات کی تسکین اور افزائش نسل کا ذریعہ دکھائی دے گا۔ لیکن ذرا فکر کی آنکھ سے دیکھو تو صاف نظر آئے گا کہ اس سے مقصود رفاقت باہمی' سکون' محبت اور رحمت ہے۔ جنسی جذبات کی تسکین یا افزائش نسل ثانوی چیز ہے۔

اس کے بعد جنسی جذبہ کی طرف آؤ۔ معلوم نہیں وہ کون تھا جس نے سب سے پہلے ابن آدم کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ اس کی ساری تاریخ اس سے متاثر چلی آ رہی ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے میں تمہیں ایک خط میں تفصیل سے بتا چکا ہوں۔ کہ ''انسانی فطرت'' کا تصور فریب سے زیادہ کچھ نہیں۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ فطرت' مجبور اشیاء کی روش زندگی کا نام ہے۔ جو صاحب اختیار ہو اس کی فطرت کیا؟ البتہ اس کی طبعی زندگی کے کچھ تقاضے ہیں' اور اس کے بعد بلند انسانی زندگی کے مقاصد۔ جہاں تک طبعی تقاضوں کا تعلق ہے وہ حیوانات اور انسان میں مشترک ہیں۔ بھوک اور پیاس انسان کے طبعی تقاضے ہیں۔ ان تقاضوں کی کیفیت یہ ہے کہ (مثلاً) تم کسی گہری سوچ میں منہمک ہو۔ تمہیں پیاس لگتی ہے۔ اس تقاضے کی ابتدائی منازل میں تم پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ لیکن یہ تقاضا آہستہ آہستہ بڑھتا چلا جاتا ہے تا آنکہ یہ تمہارے انہماک پر غالب آ جاتا ہے۔ اگر تم اس پر بھی اس کی تسکین کا سامان بہم نہیں پہنچاتے (پانی نہیں پیتے) تو تم بیمار ہو جاتے ہو۔ اس پر بھی پانی نہیں پیتے تو تمہاری موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی حالت بھوک کے تقاضے کی ہے' اگرچہ اس میں موت نسبتاً زیادہ وقت کے بعد واقع ہوتی ہے۔ اس سے تم نے دیکھا کہ طبعی تقاضے' جسم کی ضرورت کے ماتحت' از خود ابھرتے ہیں اور اگر ان کی تسکین نہ کی جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے اور آخر الامر مر جاتا ہے۔ تم سوچو سلیم! کہ کیا جنسی تقاضا بھی اس قسم کا ہے؟ بادنیٰ تعمق تم اس نتیجہ پر پہنچ جاؤ گے کہ یہ تقاضا اس قسم کا نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا۔ ساری عمر میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہوتا۔ کہ تم اپنے کام یا خیالات میں منہمک ہو اور جنسی تقاضا (پیاس کی طرح) از خود ابھر آیا ہو۔ یہ تقاضا کبھی نہیں ابھرتا جب تک تم اسے خود نہ ابھارو۔ یہ کبھی بیدار نہیں ہوتا جب تک تمہارے خیالات اسے بیدار نہ کریں۔

حیوانات میں یہ تقاضا از خود بیدار ہوتا ہے لیکن صرف اس وقت جب ان سے فطرت نے افزائش نسل کا کام لینا ہوتا ہے۔ تم سانڈ کو دیکھو۔ وہ سال بھر گایوں کے گلے میں پھرتا رہے گا لیکن نہ کبھی کوئی گائے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے گی' نہ وہ خود اس کی طرف متوجہ ہو گا۔ لیکن جب ان کے اختلاط کا موسم (Mating Season) یا وقت آئے گا تو یہ جذبہ از خود بیدار ہو جائے گا اور اختلاط کے بعد از خود سو جائے گا۔ تم نے دیکھا کہ وہاں بھی یہ جذبہ بھوک اور پیاس کے جذبات کی طرح نہیں۔ یہ صرف اس وقت بیدار ہوتا ہے جب اس سے افزائش نسل مقصود ہو۔

لیکن انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ انسان ان تقاضوں کو اپنے اختیار سے ابھار سکتا ہے۔ تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ فطرت نے حیوان اور انسان میں یہ فرق کیوں رکھا ہے؟ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ فطرت اولاد پیدا کرنے کے معاملہ میں انسان کو' حیوانات کی طرح' مجبور نہیں رکھنا چاہتی۔ حیوانات کو جب ''ادھر کا اشارہ'' 5 ہوتا ہے تو وہ اولاد پیدا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن انسان کے معاملہ میں فطرت ایسا نہیں کرنا چاہتی۔ وہ اس معاملہ کو انسان کے اختیار میں دے دیتی ہے کہ وہ جب اولاد پیدا کرنا چاہے' اپنی مرضی سے اس جذبہ کو ابھارے اور افزائش نسل کی صلاحیت کو بروئے کار لے آئے۔

لیکن انسان' جس طرح دیگر معاملات میں اپنے اختیار کو ناجائز استعمال کرتا ہے اسی طرح اس معاملہ میں بھی کرتا ہے۔ فطرت نے اس کی طبعی ضروریات کو پورا کرنے کے سلسلہ میں یہ التزام بھی رکھا ہے کہ ضرورت پوری ہونے کے ساتھ کچھ لذت بھی مل جائے۔ مثلاً غذا سے مقصود' جسم کی پرورش ہے لیکن فطرت نے غذاؤں میں لذت بھی رکھ دی ہے۔ اب دیکھو کہ انسان نے اس باب میں کیا کیا ہے؟ اس نے ضرورت کے پہلو کو محض بامر مجبوری ساتھ رکھا ہے اور لذت کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دیتا چلا گیا۔ چنانچہ اب حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ہمارے (کھاتے پیتے گھرانوں میں) کھانوں میں ایک فیصد ''ضرورت'' کا پہلو ہوتا ہے تو ننانوے فیصد لذت کا۔ حصول لذت ممنوع نہیں' بشرطیکہ لذت ضرورت کے تابع رہے نہ کہ مقصود بالذات بن جائے جس طرح انسان نے' اپنے اختیار و ارادہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر' کھانے پینے کے معاملہ میں لذت کو مقدم قرار دے لیا اور ضرورت کو مؤخر اسی طرح اس نے جنسی صلاحیت کے ساتھ کیا۔ وہ صلاحیت ملی تھی افزائش نسل کی خاطر (جس کے ساتھ فطرت نے لذت بھی شامل کر دی تھی) لیکن اس نے جنسی لذت کو مقصود بالذات سمجھ لیا اور ضرورت کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اس نے ضرورت کے عنصر کو خارج ہی کر دینا چاہا اور لذت ہی لذت کو باقی رکھنے کی کوشش کی۔ (بعینہٖ جس طرح تم نے بعض لوگوں کے متعلق سنا ہوگا کہ وہ لذیذ ترین غذائیں کھاتے ہیں اور جب پیٹ بھر جاتا ہے تو حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دیتے ہیں اور پھر کھانے لگ جاتے ہیں)۔ ضرورت کے عنصر کو خارج کر کے' محض لذت کو مقصود بنا لینا ایسی ''جنسی بدنہادی'' (Sex Perversion) پیدا کر دیتا ہے جس کی آخری حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ عام زنا کاری اس کی ابتدائی شکل ہے جس میں ضرورت (یعنی اولاد پیدا کرنے کے مقصد) کو خارج کر کے خالص لذت کو مقصود بنا لیا جاتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد حصول لذت کے سینکڑوں طرق و اطوار ایجاد و اختیار کئے جاتے ہیں۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ جنسی صلاحیت کا مقصد افزائش نسل ہے۔ اس مقصد کو چھوڑ کر اسے محض حصول لذت کے لئے استعمال کرنا مقصد فطرت کے خلاف ہے۔ قرآن کریم نے جنسی اختلاط کے جائز و ناجائز ہونے کے لئے دو اصطلاحات استعمال کی ہیں جو اس حقیقت کو نکھار کر سامنے لے آتی ہیں۔ وہ ان رشتوں کی فہرست دے کر جن سے نکاح حرام ہے' کہتا ہے کہ باقی عوتیں تمہارے لئے حلال ہیں بشرطیکہ ان سے اختلاط ''محصنین غیر مسافحین ہو (۴/۲۴)۔ ''محصنین'' کے معنی ہیں حفاظت سے رکھنا۔ قلعہ بند کر لینا۔ اور ''مسافحین'' کے معنی ہیں محض بہا دینے کی خاطر جنسی اختلاط کرنا۔ چونکہ نکاح اور زنا میں ابتدائی فرق یہ ہے کہ نکاح میں جنسی اختلاط سے مقصد' نطفہ کو رحم میں محفوظ کر دینا ہوتا ہے تاکہ اس سے افزائش نسل ہو' اور زنا میں کوشش کی جاتی ہے کہ لذت تو ملے لیکن نطفہ نہ ٹھہرے (وہ بہہ جائے) اس لئے قرآن کریم کی ان اصطلاحات کا اولین مفہوم بالترتیب نکاح اور زنا ہے۔ لیکن اس سے قرآن کریم نے خود جنسی اختلاط کی نوعیت اور غایت کو بھی واضح کر دیا ہے۔ یعنی

(i) اگر جنسی اختلاط بلا نکاح ہے تو وہ ہر حال میں ناجائز ہے۔ اس سے مقصد محض حصول لذت ہوتا ہے۔

(ii) نکاح کے ساتھ' جنسی اختلاط سے مقصد افزائش نسل ہے۔ اگر یہ مقصد پیش نظر نہیں' اور اختلاط محض حصول لذت کے لئے ہے تو یہ فطرت کی عطا کردہ صلاحیت کا غلط استعمال ہے۔ اس صورت میں بیوی ''حرث'' (کھیتی) نہیں رہتی۔ عیاشی کا سامان بن جاتی ہے۔

(iii) اس صلاحیت کا صحیح استعمال یہ ہے کہ نکاح کے بعد' جنسی اختلاط افزائش نسل کے لئے ہو۔ بیوی ''حرث'' (کھیتی)

رہے۔لذت کی خاطر جنسی صلاحیت ضائع کرنے کا آلہ بن کر نہ رہ جائے۔

اس سے ضبط ولادت کا سارا مسئلہ صاف ہو جاتا ہے۔یہ تم پہلے دیکھ چکے ہو کہ:

(الف) اولاد عندالضرورت پیدا کرنی چاہئے۔انسان کو اس باب میں اختیار ملا ہی اس مقصد کے لئے تھا اور یہ تم نے اب دیکھ لیا ہے کہ

(ب) غیر منکوحہ عورت کے ساتھ جنسی اختلاط حرام ہے۔

اور

(ج) منکوحہ بیوی کے ساتھ اختلاط اس وقت مطابقِ مقصدِ فطرت ہے جب اولاد پیدا کرنا مقصود ہو۔

لہٰذا جب اولاد پیدا کرنا مقصود نہ ہو' تو بیوی کے ساتھ جنسی اختلاط کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔اس لئے قرآن کریم کی رو سے' خاندانی منصوبہ بندی کے لئے نہ مانع حمل ادویات و تدابیر کی ضرورت رہتی ہے اور نہ ہی مرد یا عورت کو بانجھ بنا دینے کی حاجت۔وہ خود عائد کردہ پابندی کے ماتحت' باہمی اختلاط سے مجتنب رہتے ہیں اور اس وقت تک مجتنب رہتے ہیں جب تک انہیں بچہ پیدا کرنے کی ضرورت نہ ہو۔اس میں نہ ''عزل'' کی ضرورت پڑتی ہے 6 اور نہ ہی مانع حمل تدابیر کے عام ہونے سے' حرامکاری کے بڑھ جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔

مجھے اندازہ ہے کہ تم جھٹ سے کہہ دو گے کہ یہ ناممکن ہے۔بیوی بھلی چنگی موجود ہو اور مرد برسوں تک اس کے پاس نہ جائے۔یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے؟ یہی وہ مقام تھا جس کے متعلق میں نے شروع میں (Warning) دی تھی کہ چونکہ یہ بات تمہارے سامنے (غالباً) پہلی دفعہ آئے گی اور انوکھی سی معلوم ہو گی اس لئے تم سطحی طور پر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ جانا۔گہرے غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا۔

یہ ناممکن نہیں سلیم! ممکن ہے اور ایسا ممکن کہ اس کے لئے تمہیں کسی کاوش و تردد کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔تم نے دیکھ لیا ہے کہ جنسی جذبات انسان کے اپنے خیال سے بیدار ہوتے ہیں از خود کبھی نہیں ابھرتے۔اور انسان کے خیالات اس کی تعلیم و تربیت اور عقائد و نظریات کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔تم سوچو کہ بیوی کے ''ایام'' کے دوران ہمارا خیال تک بھی مقاربت کی طرف نہیں جاتا۔لیکن ایک غیر مسلم اس میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔یہ کیوں ہے؟ اس کے لئے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ان دنوں مقاربت جائز نہیں۔اس لئے ہمارا خیال بھی اس طرف نہیں جاتا۔یا مثلاً ایک غلط کار نوجوان جو غیر عورتوں تک پہنچنے میں اپنی جان تک کی بازی لگا دیتا ہے' راتوں کی تنہائی میں' اپنی جوان ہمشیرہ کے پاس سویا رہتا ہے حالانکہ اس وقت کمرے میں کوئی تیسرا نہیں ہوتا۔لیکن اس کی طرف وہ نگاہ بد سے دیکھتا تک نہیں۔

یہ سب خیالات کا کرشمہ نہیں تو اور کیا ہے؟ 7 غالباً پچھلے سال کا ذکر ہے۔اخبارات میں امریکہ کے ایک جوڑے کا حال شائع ہوا تھا جو آٹھ دس سال سے میاں بیوی کی حیثیت سے خوش و خرم رہتے تھے۔(تم نے بھی شاید یہ واقعہ پڑھا ہو) ان کے ہاں نہایت خوبصورت دو تین بچے بھی تھے کہ ایک دن اتفاقاً ان کے علم میں یہ بات آئی کہ وہ بہن بھائی ہیں۔ہوا یوں کہ وہ بچے ہی تھے کہ انگلینڈ میں ان کے ماں باپ مارے گئے۔لڑکے کو کوئی فوجی اپنے ساتھ لے گیا اور لڑکی کو ایک امریکن اپنے ساتھ لے آیا۔دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بالکل بے خبر تھے۔بھائی کو اس کا علم نہیں تھا کہ اس کی کوئی بہن ہے اور بہن یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا کوئی بھائی ہے۔اتفاق سے لڑائی کے بعد' وہ لڑکا امریکہ جا پہنچا اور یونہی اس کی ملاقات اس لڑکی سے ہوگئی (جواب جوان ہو چکی تھی) اور اس طرح ان دونوں کی شادی ہو گئی اور برسوں تک انہیں اپنی سابقہ رشتہ داری کا علم نہ ہو سکا۔کیونکہ بچپن کا کوئی واقعہ انہیں یاد نہیں تھا۔

جس دن انہیں معلوم ہوا ہے کہ وہ بھائی بہن ہیں' ان کی شادی کو آٹھ دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن اس بات کا علم ہونے کے بعد ان پر جو قیامت گزری ہے اس کا اندازہ ان بیانات سے لگ سکتا ہے جو انہوں نے اخبارات کو دیئے تھے۔ ان کے کتنے دن رونے میں کٹ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں؟ بہرحال پادریوں نے ان کی تسلی تشفی کی اور وہ پھر بہن بھائی کی زندگی بسر کرنے لگ گئے!

یہ کیا تھا؟ صرف اس خیال کا اثر کہ بہن بھائی' ازدواجی رشتہ میں منسلک نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ ایران کے شہنشاہ' کھلے بندوں اپنی بہنوں سے شادی کر لیا کرتے تھے۔ یہ ہے خیالات کا اثر!

لہٰذا اگر ہم قرآن کریم کے اس تصور کو اپنے عقیدہ کا جزو بنالیں کہ بیوی سے جنسی اختلاط صرف افزائش نسل کے لئے کیا جا سکتا ہے تو ہمیں اس مقصد کے علاوہ جنسی مقاربت کا خیال تک بھی نہیں آئے گا اور ہم اس کے تصور سے اسی طرح دور بھاگیں گے جس طرح ''ایام'' کے دوران میں مقاربت کے خیال سے۔ ہمارے ہاں بیس پچیس برس ادھر تک (گاؤں میں بالخصوص) یہ خیال عام تھا کہ جب تک بچہ دودھ پیتا رہے' مقاربت نہیں کرنی چاہئے۔ اس پر لوگ اس شدت سے پابند تھے کہ اگر کسی سے اس کی خلاف ورزی ہو جاتی تھی تو وہ منہ چھپائے پھرتا تھا۔ ان تصریحات سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جنسی جذبہ' انسانی خیالات کے تابع رہتا ہے اس لئے اس پر کنٹرول کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ قران کریم جنسی جذبہ کے لئے ''اضطراری حالت'' کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ جہاں تک بھوک کا تعلق ہے وہ اضطراری حالت کے امکان کو تسلیم کرتا ہے۔ اسی لئے اس نے ایسی حالت میں حرام تک کھانے کی اجازت دے دی ہے۔ لیکن جنسی تقاضے کے لئے اس نے اس کی کہیں اجازت نہیں دی۔ اس کے برعکس اس نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ

ولیستعفف الذین لا یجدون نکاحا (۲۴/۳۳)۔ ''جو لوگ شادی کا سامان نہیں پاتے' انہیں ضبط خویش سے کام لینا چاہئے۔'' یعنی اس نے یہ نہیں کہا کہ جس طرح کھانے کے معاملے میں اضطراری حالت میں حرام کھا لینے کی اجازت ہے اسی طرح ایسے شخص کے لئے بھی' جسے جائز طریق سے جنسی تسکین کا سامان میسر نہ ہو' حرامکاری کی اجازت ہے۔

یہ تھا جنسیت کا وہ تصور جو قرآن کریم نے پیش کیا تھا ذرا غور کرو کہ اس تصور کی رو سے قرآن کریم' انسانیت کو کس مقام پر لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن جب ہمارے ہاتھوں سے قرآن کریم کا دامن چھوٹ گیا تو جنسیات کے متعلق ہمارا تصور پست ترین سطح پر پہنچ گیا۔ ذرا سوچو کہ جس قوم کی یہ حالت ہو کہ ان کے سلاطین کے محلات میں دو دو تین تین ہزار ممتوعہ لونڈیاں ہوں۔ جن کے بازاروں میں عورتیں بھیڑ بکری کی طرح فروخت اور نیلام ہوتی ہوں۔ جو چار بیویوں کے لئے وجۂ جواز یہ قرار دیں کہ اس سے ایسا پروگرام مرتب ہو جاتا ہے جس میں کوئی شب مقاربت سے خالی نہیں رہ سکتی اور قیامت یہ کہ وہ ان چیزوں کو ''شریعت حقہ'' کے عین مطابق قرار دیں۔ ان کے جنسی تصور کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت رہ جاتی ہے؟ ہماری قوم کس حد تک جنسیات میں ڈوبی ہوئی ہے اس کا اندازہ لگانا ہو تو تم طب یونانی کی کوئی کتاب (بلکہ کسی یونانی دواخانہ کی فہرست ادویات) اٹھاؤ اور دیکھو کہ اسمیں کتنے فیصد دوائیاں جنسیات کے ذیل میں آتی ہیں؟ اسی جنسیت زدہ ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ہاں اس قسم کے فتاویٰ دیئے جاتے ہیں کہ (مثلاً) اگر ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی کسی ایسے جزیرہ میں پہنچ جائیں جہاں کوئی تیسرا نہ ہو تو وہ آبادی کی طرف واپسی تک ''عارضی نکاح'' کر سکتے ہیں یعنی یہ ذہنیت اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ ایک نوجوان جوڑا' چند دنوں کے لئے بھی' جنسی اختلاط کے بغیر گزارہ کر سکتا ہے۔ یہ اس قوم کی حالت ہے جس کی آسمانی کتاب

جنسیات میں اضطراری کیفیت کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ اس لئے کہ وہ جنسیات کو اس مقام پر رکھتی ہے جو مقام اسے فطرت کے پروگرام کے مطابق ملا ہے۔ ہم نے جنسیات کو اس مقام سے اتار کر اپنے اعصاب پر سوار کر لیا ہے اور پھر اسی کو اس کا صحیح مقام قرار دے کر اس سے پیدا شدہ مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے نکلتے ہیں! نتیجہ ظاہر ہے۔

ہمارا اپنا جنسی تصور یہ تھا۔ اس پر مغربی خیالات کے جھکڑ نے اس آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔ یہ وہ آتشِ ویرانہ ہے جس کے نرغے میں ہماری موجودہ نسل گھری ہوئی ہے۔ اسے اس عذاب سے نجات دلانے کی شکل اس کے سوا کوئی اور نہیں کہ

(i) جنسیات کے متعلق ہمارے قدیم مذہبی تصور میں بنیادی تبدیلی کی جائے اور

(ii) مغربی خیالات کے طوفان کو روکنے کے لئے محکم تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس کے لئے ازبس ضروری ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم کو قرآنی خطوط پر متشکل کریں اور معاشرہ کی عمارت، قرآنی بنیادوں پر استوار کریں۔

جو کچھ گزشتہ صفحات میں کہا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ

۱۔ ضبط ولادت کا سوال اس لئے اہمیت اختیار کر رہا ہے کہ ہمارے ملک کی پیداوار بڑھتی ہوئی آبادی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔

۲۔ اس مشکل مسئلہ کے حل کے دو گوشے ہیں۔

(i) ملک کی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ حد تک بڑھانے کا انتظام کیا جائے۔ اور

(ii) اگر اس کے بعد بھی ضرورت رہے تو افزائش نسل پر حد بندی عائد کر دی جائے۔

۳۔ جہاں تک شق (i) کا تعلق ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ملک میں قرآنی نظام ربوبیت رائج کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذرائع پیداوار قوم کی تحویل میں رہیں تاکہ جو منافع اس وقت افراد کے ہاں جمع ہو جاتا ہے وہ پیداوار کے اضافہ کے لئے صرف کیا جا سکے۔ اور

(ب) رزق کی تقسیم ضرورت کے مطابق مملکت کی زیرنگرانی ہو۔

۴۔ جہاں تک شق (ii) کا تعلق ہے قرآن کریم کی رو سے یہ چیز قابل اعتراض نہیں کہ اس قسم کی اجتماعی اور ہنگامی ضرورت کے لئے افزائش نسل پر پابندی عائد کر دی جائے۔ فطرت نے اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کو انسان کی مرضی کے تابع رکھا ہی اس لئے ہے کہ اسے افزائش نسل پر کنٹرول رہے۔ یہ اس معاملہ میں حیوانات کی طرح بے بس اور مجبور نہیں۔

۵۔ لیکن برتھ کنٹرول (ضبط ولادت) کا طریقہ سیلف کنٹرول (ضبط خویش) ہے۔ آلات وادویات کے ذریعہ ایسی شکل پیدا کرنا، جس سے لذت حاصل ہو جائے لیکن استقرار حمل نہ ہو، جنسی اختلاط کے فطری مقصد کے خلاف ہے۔ جنسی اختلاط افزائش نسل کے لئے ہے نہ کہ حصول لذت کے لئے۔ اگر افزائش نسل مقصود نہ ہو تو اختلاط بے محل ہو جاتا ہے۔

۶۔ اس قسم کا ضبط خویش، ناممکن تو ایک طرف، ذرا بھی مشکل نہیں۔ جنسی جذبہ انسانی خیالات کے تابع رکھا گیا ہے۔ اگر اس طرح خیال نہ کیا جائے تو یہ جذبہ بیدار ہی نہیں ہوتا۔

۷۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ

(i) جنسیات کے متعلق صحیح قرآنی تصور عام کیا جائے۔

(ii) معاشرہ میں عورت کو وہ عزت کا مقام دیا جائے جس سے وہ جنسی جذبہ کی تسکین کا ذریعہ متصور ہونے کے بجائے وجہ تکریم انسانیت سمجھی جائے۔

(iii) ان تمام اسباب و ذرائع کو سختی سے روکا جائے جو جنسی جذبہ کی بیداری کو عام کر رہے ہیں۔ جنسی اشتعال

پیدا کرنے والی فلمیں، تصاویر، لٹریچر، آرٹ، نمود حسن اور عریانیت کے مظاہر، وغیرہ وغیرہ۔ اور

(iv) تعلیمی نظام کو صحیح خطوط پر متشکل کیا جائے۔

اس طرح نہ صرف یہ کہ ضبط ولادت کا مسئلہ آسان ہو جائے گا بلکہ قوم کے پاس اس قدر عظیم توانائیاں محفوظ ہو جائیں گی جن سے ہر تعمیری پروگرام بطریق احسن تکمیل تک پہنچ جائے گا۔ قرآن کی بتائی ہوئی یہ وہ حقیقت ہے جس کی شہادت مغرب کے محققین بھی دے رہے ہیں میں تمہیں اس سے پہلے ایک خط میں تفصیلاً بتا چکا ہوں کہ جنسیات کے مشہور محقق ڈاکٹر (J.D.Unwin) نے اپنی کتاب (Sex and Culture) میں اپنی تحقیقات کے نتائج کس وضاحت سے پیش کئے ہیں۔ اس مقام پر اس کے دو اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔ تم دیکھو کہ وہ جنسی توانائی کے متعلق کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

> کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں۔ جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیں۔ اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع قلیل ترین حد تک محدود کر دیئے جائیں) مسلسل آگے بڑھاتی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی۔ (صفحہ ۴۱۴)

وہ اپنی کتاب کے آخر میں لکھتا ہے۔

> اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدت مدید تک، بلکہ ابدالآباد تک، قائم اور آگے بڑھتی رہیں، تو اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ پہلے اپنی تخلیق نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن میں معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع، ایک مدت مدید تک، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، کم از کم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کا رخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہوں گی۔ وہ تہذیب وتمدن کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی معاشرہ نہیں پہنچ سکا اور انسان کی توانائیاں ان روایات کو ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں نہیں آ سکتا۔ (صفحہ ۴۳۲)۔

لیکن یہ بات سلیم! ابھی انسان کی سمجھ میں شاید ہی آ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو ابھی تک بالعموم انسانی قامت نصیب ہی نہیں ہو سکا۔ یہ ابھی تک (بہ ہیئت مجموعی) حیوانیت کے دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔ بلکہ اس کی سطح حیوانوں سے بھی پست ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ

۱۔ فطرت نے حیوانات کے جنسی جذبہ پر خود Safety Valve لگا دیا ہے وہ اسے اس وقت بیدار کرتی ہے جب ان سے اولاد پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حیوانات خاندانی مصنوبہ بندی (Family Planning) نہیں کر سکتے۔ انہیں اس کا اختیار ہی نہیں دیا گیا۔ لیکن اس عدم اختیار کا انہیں فائدہ یہ ہے کہ ان کی اس قدر قیمتی توانائی ضائع نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ محض لذت کی خاطر جنسی اختلاط پر قادر ہی نہیں۔

۲۔ انسان کو فطرت نے اس کا اختیار دیا ہے کہ وہ (Family Planning) کر سکے۔ یعنی وہ اس باب میں حیوان کی طرح مجبور نہیں کہ جب فطرت چاہے اس سے اولاد پیدا کرا لے۔ انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی (Planning) کے مطابق اولاد پیدا کرے۔ یہ فطرت کی

بہت بڑی بخشائش تھی جس سے اس نے انسان کو نوازا تھا۔

۳۔ لیکن انسان کیا کرتا ہے؟ یہ Family Planning نہیں کرتا۔ اس اعتبار سے یہ اپنے آپ کو حیوانات کے درجے تک رکھتا ہے۔ یعنی وہ فیملی پلاننگ کر نہیں سکتے۔ یہ کر سکتا ہے لیکن کرتا نہیں۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ لیکن یہ اس کے ساتھ ہی اپنی اس قدر قیمتی توانائی کو محض حصول لذت کے لئے ضائع کرتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ حیوانات سے بھی پست درجہ پر ہے۔ وہ فیملی پلاننگ نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنی توانائی کو تو محفوظ رکھ سکتے ہیں! یہ اپنے اختیار کے غلط استعمال سے دوہرے نقصان میں رہتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے ایسے انسانوں کے متعلق جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے کہا ہے کہ اولئك كالانعام بل هم اضل (۷/۱۷۹)۔ یہ حیوانات کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ دوسری جگہ ہے لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددنه اسفل سافلین..... (۹۵/۵۔۴)۔ ہم نے انسان کو بہترین توازن کے ساتھ حسین ترین ہیئت سے پیدا کیا تھا لیکن (یہ جو کچھ کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ) ہم اسے پست سے پست ترین سطح تک لے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ کیا یہ انسان کی پست ترین سطح نہیں کہ فیملی پلاننگ کی جو امکانی صلاحیت اسے خصوصیت سے عطا ہوئی تھی' یہ اس سے تو فائدہ نہ اٹھائے اور اپنے اختیار کے بیجا استعمال سے اپنی توانائیوں کو ضائع کر کے حیوانات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ نقصان میں رہے؟ والعصر ان الانسان لفی خسر (۱۰۳/۲۔۱)۔ زمانہ کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان نے ہمیشہ اپنا نقصان کیا ہے۔

کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ فیملی پلاننگ کا تعلق عقل وفکر (Reason) سے ہے اور جنسی لذت کے حصول کا تعلق جذبات سے۔ جب بھی انسان عقل وفکر کو جذبات کے تابع رکھے گا' نقصان اٹھائے گا۔ لیکن جب جذبات سے عقل وفکر کی راہ نمائی میں کام لے گا' کامیاب ہوگا۔ قرآن کریم یہی سکھانے کے لئے آیا تھا کہ جذبات کو کس طرح عقل وفکر کے تابع رکھا جاتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان کی ساری (Problems) تین ہیں۔ زر' زمین' زن۔ انسان نے ان تینوں معاملات میں' جذبات کو عقل وفکر (یا یوں سمجھو کہ حصول لذت کو ضرورت) پر غالب رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے معاشرہ میں فساد ہی فساد رونما ہوتا چلا جا رہا ہے۔ قرآن کریم نے ان تینوں (اہم ترین اور مشکل ترین مسائل کا حل ایک ایک فقرہ میں کر دیا اس نے کہا کہ زر (دولت) مبادلۂ اشیاء کا آسان ذریعہ ہے اس سے یہی کام لینا چاہئے۔ اسے ہوس زراندوزی یا لذت اقتدار کی خاطر جمع کرتے رہنا اس کا بڑا غلط استعمال ہے۔ اس نے کہہ دیا کہ صحیح معاشی نظام وہ ہے جس میں فاضلہ دولت کسی کے پاس نہ رہے۔ (۲/۲۱۹) اس سے اس نے ''زر'' سے پیدا ہونے والے تمام مفاسد کا علاج کر دیا۔ یعنی اس نے زر کو ضرورت کی شے قرار دیا۔ جذبات کی تسکین کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔

زمین کے متعلق اس نے کہا کہ یہ نوع انسان کی پرورش کا سامان بہم پہنچاتی ہے (۷۳/۵۶) (۲۰۔۱۹/۱۵)۔ اس لئے اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھنا چاہئے۔ (۱۰/۴۱) اس (ذریعۂ رزق) کو ذاتی ملکیت میں لے لینا' تاکہ دوسرے انسان تمہارے دست نگر ہو جائیں اور یوں تم حکومت کرنے کے جذبہ کی تسکین کر سکو' بہت بڑا ظلم ہے (''ظلم'' کے معنی ہیں کسی شے کو اس مقام پر رکھنا جس کے لئے اسے بنایا نہیں گیا)۔ اس نے زمین کو بھی ضرورت کے لئے استعمال کرنا سکھایا۔ جذبات کی تسکین کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔

اسی طرح اس نے ''زن'' کے متعلق کہہ دیا کہ جنسی اختلاط سے مقصد اولاد پیدا کرنا ہے' نہ کہ محض لذت حاصل کرنا۔

یہاں بھی اس نے جذبات کو ضرورت کے تابع رکھا ہے۔ اس نے اس طرح اس مشکل ترین مسئلہ کو بھی حل کر دیا۔

زر اور زمین کے متعلق انسان رفتہ رفتہ قرآنی تصور کی طرف آ رہا ہے لیکن زن کے متعلق ابھی اس نے اپنے نظریہ میں تبدیلی کا احساس نہیں کیا۔ اگرچہ یہ مسئلہ اس کے لئے وبال جان بن رہا ہے۔

جس دن انسان نے فطرت کا یہ راز پا لیا کہ انسان کو جنسی جذبہ پر اختیار وارادہ اسی لئے دیا گیا ہے کہ وہ افزائش نسل کو اپنے کنٹرول میں رکھ سکے اور جنسی اختلاط سے مقصود افزائش نسل ہے، نہ کہ محض حصول لذت، وہ دن انسانیت کی تاریخ میں عظیم انقلاب کے آغاز کا دن ہوگا۔ دیکھیں یہ سعادت سب سے پہلے کس قوم کے حصے میں آتی ہے؟

جی چاہتا ہے کہ یہ سعادت پاکستان ہی کے حصے میں آئے۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس پروگرام کی تکمیل میں وقت لگے گا۔ اس لئے اگر ہمارے حالات کا تقاضا یہ ہو کہ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کی فوری روک تھام کی جائے تو بامر مجبوری کچھ وقت کے لئے ضبط ولادت کی ایسی تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں جو مضر صحت نہ ہوں۔ لیکن اس صورت میں اس پر کڑی نگرانی کی جانی ضروری ہے کہ یہ چیزیں ان ہاتھوں تک نہ پہنچنے پائیں جو ان کا ناجائز استعمال کریں۔ اگر ہمارے ہاں اسلامی آئین نافذ ہو گیا تو اس وقت انسداد فحش کاری کے لئے محکم تدابیر اختیار کی جانی ضروری ہوں گی۔ یہ چیز بھی اسی ذیل میں آئے گی۔

لیکن یہ محض ہنگامی تدبیر ہو گی۔ مستقل اور مطابقِ منشائے فطرت وہی تدبیر ہو گی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یعنی جنسی اختلاط کو صرف اولاد پیدا کرنے کے لئے صحیح سمجھنا۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے یہ چیز صحیح تعلیم وتربیت سے حاصل ہو سکے گی۔

یہ ہے سلیم! ضبطِ ولادت کے متعلق قرآن کریم کی تعلیم کا ماحصل۔

اچھا خدا حافظ! اس کے بعد دیکھئے کب ملاقات کا موقعہ ملتا ہے۔ طاہرہ بیٹی سے بہت بہت دعا کہنا اور جاوید میاں کو دیدہ بوسی۔ اللہ اس قرآنی گھرانے پر اپنے سحاب کرم کی بارش کرے۔

والسلام

پرویز

جولائی ۱۹۶۰ء

حواشی:-

1. جنسی اختلاط تو کرنا لیکن مادۂ تولید کا انزال رحم کے اندر نہ ہونے دینا۔
2. بخاری جلد اول۔ ترجمہ شائع کردہ نور محمد کراچی صفحہ 492۔
3. بخاری جلد اول۔ ترجمہ شائع کردہ نور محمد کراچی صفحہ 573۔
4. یہی وجہ ہے کہ رخصتی کے بعد اس جوڑے کی پہلی ملاقات، جنسی اختلاط پر منتج ہوتی ہے۔
5. چاک مت کر جیب بے ایام گل ۔۔۔ کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہئے (غالب)
6. عزل افزائش نسل کے مقصد سے گریز اور لذت کے حصول کا اس زمانے کا وضع کردہ ذریعہ تھا۔ جب ہنوز مانع حمل آلات وغیرہ ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ اس سے تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ جب میں نے کہا تھا کہ عزل سے متعلق روایات کبھی نبی اکرمؐ کی احادیث نہیں ہو سکتیں تو اس کی وجہ کیا تھی۔ کیا تم اسے تصور میں بھی لا سکتے ہو کہ صحابہ کبارؓ عزل کی اجازت مانگتے ہوں گے اور رسولؐ اللہ اس کی اجازت دیتے ہوں گے؟ اور وہ بھی اس مقصد کے لئے کہ اگر لونڈیوں کو حمل قرار پا گیا تو ان کی قیمت کم ہو جائے گی۔ استغفر اللہ!
7. بعض اوقات ایسے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں جن میں لوگ بہنوں بیٹیوں تک پر بھی دست درازی کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن یہ استثنائی حالات انتہائی درجہ کی مریض ذہنیت کے مظاہر ہوتے ہیں انسان کی عمومی کیفیت وہی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ''انتہائی درجہ کے مجرم'' تو مستثنیات میں سے ہوتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنی اسرائیل

حضرت یعقوبؑ (حضرت ابراہیمؑ کے پوتے) کا لقب اسرائیل (یعنی مردِ خدا) تھا۔ آپ کی اولاد سے جو نسل آگے بڑھی اسے بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ آپ کے چوتھے بیٹے کا نام یہودہ (Juda) تھا۔ یہودہ اور بن یامین کی نسل کا قبیلہ' فلسطین کے علاقہ (Juda) میں حکمران تھا۔ اس قبیلہ کو اسی نسبت سے یہودی کہتے تھے اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل۔ لیکن بعد میں عام طور پر یہ تفریق باقی نہ رہی اور بنی اسرائیل اور یہودی سے ایک ہی مفہوم لیا جانے لگا۔

حضرت یعقوبؑ کا وطن کنعان (فلسطین) تھا لیکن جب حضرت یوسفؑ مصر میں صاحبِ اقتدار ہو گئے تو انہوں نے اپنے والد اور تمام خاندان کو مصر بلا لیا۔ حضرت یوسفؑ کی وجہ سے مصر میں اس قبیلہ کی بڑی تعظیم و تکریم ہوئی۔ چار سو برس تک یہ مصر میں رہے اور جو قبیلہ چند نفوس پر مشتمل تھا اس عرصہ میں ایک کثیر التعداد قوم بن گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ انقلاب بھی آیا کہ فراعنۂ مصر نے انہیں اپنا محکوم بنا لیا اور جو برتاؤ محکوموں کے ساتھ ہوتا ہے وہی ان کے ساتھ ہونے لگا۔ جب ان کی ذلت و پستی انتہا تک پہنچ گئی تو ان کی طرف حضرت موسیٰؑ مبعوث ہوئے جو انہیں فرعون کی غلامی سے نجات دلا کر پھر فلسطین کے میدانوں کی طرف لے گئے۔ یہ واقعہ قریب ۱۶۰۰ ق۔م کا ہے۔ یہاں انہوں نے بڑا عروج حاصل کیا۔ ان میں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ جیسے صاحب سطوت و شوکت نبی پیدا ہوئے۔ لیکن اس کے بعد اس قوم نے قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تشتت و انتشار کے عذاب میں مبتلا ہو کر دن بدن کمزور ہوتی چلی گئی۔ ۵۹۹ ق۔م میں بابل کے شاہنشاہ بنوکدنصر (بخت نصر) نے یروشلم (بیت المقدس) پر حملہ کیا اور یہودیوں کے اس ملی مرکز کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ انہیں قید کر کے بابل لے گیا اور وہاں ذلیل ترین زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ (قرآن کریم نے یہودیوں کی اس پہلی تباہی کی طرف (۵/۱۷) میں اشارہ کیا ہے)۔ قریب اسی سال تک یہ اس عذاب میں مبتلا رہے تا آنکہ فارس کے تین بڑے بڑے شاہنشاہ خورس (ذوالقرنین) دارا اور ارتخشتا یکے بعد دیگرے ان کی امداد کے لئے آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے انہیں بابل کی قید سے رہائی دلا کر یوروشلم کی دوبارہ آبادی اور ہیکل کی تعمیر کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۵۱۵ ق۔م میں ہیکل دوبارہ تعمیر ہو گیا اور آوارۂ وطن یہودی پھر اپنے ملی مرکز میں آباد ہو گئے۔ (قرآن نے اس کی طرف (۷/۱۷) میں اشارہ کیا ہے اور (۲/۲۵۹) میں اس سو سال کی ''مدت'' کو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد یہودیوں کی پھر وہی حالت ہو گئی۔ چنانچہ ۳۳۲ ق۔م میں پہلے اسکندر نے ان پر حملہ کر کے ان کا شیرازہ بکھیر دیا اور پھر ۳۲۰ ق۔م میں بطلیموس (Ptolemy) نے یروشلم پر قبضہ کر کے ان کی رہی سہی قوت کو بھی ختم کر دیا۔ انٹی گونس کے عہد میں یہ تمام علاقہ یونانیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ اس کے بعد ۶۶ ق۔م میں پائی (رومی) نے یروشلم کو تباہ کیا۔ ۵۱ ق۔م میں ایک اور یورش نے ان کے وقار کو یکسر ختم کر دیا (قرآن کریم نے (۷/۱۷) میں اس دوسری تباہی کی طرف اشارہ کیا ہے)۔

اس مقام پر فطرت نے انہیں باز آفرینی کا ایک اور موقعہ دیا اور ان میں حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے۔ لیکن ہیکل کے مشائخ و

علماء نے حکومت کے ساتھ مل کر آپ کے خلاف سازش کی اور اس طرح اپنی تباہی پر خود اپنے ہاتھوں مہر ثبت کر دی۔ ۷۰ء میں رومیوں کے گورنر ٹائٹس نے ان پر آخری وار کیا جس سے (مرکزی حیثیت سے) ان کا نام ونشان تک مٹ گیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں:

۷۰ء مہینے کی دسویں تاریخ کو ایسے خوف و ہراس کے عالم میں جس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی، سقوط یروشلم عمل میں آیا۔ ہیکل کو جلا دیا گیا اور اس طرح یہودی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

یہودیوں کے علماء ومشائخ نے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کیوں کی تھی اس کے متعلق انجیل برنباس کا یہ بیان قابل غور ہے۔ اس کتاب کی فصل ۱۴۲ میں لکھا ہے کہ

''تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا' اگر یہ آدمی بادشاہ ہوگیا تو ہم کیا کریں گے۔ ہم پر یہ بڑی مصیبت ہوگی۔ اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ اس وقت تو یہ ہماری تقالید (رسومات) کو باطل کرنے کی قوت نہیں رکھتا۔ لیکن (اگر اسے حکومت حاصل ہوگئی تو) اس کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔ حالانکہ اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور ہمارا حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ کرنے والے نہیں ہیں جیسا کہ ہم ان کی شریعت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ اور اسی سبب سے ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہے وہ کر لیں گے۔ (اس وقت) اگر ہم غلطی کرتے ہیں تو ہمارا خدا رحیم ہے۔ قربانی اور روزہ کے ساتھ اسے راضی کر لینا ممکن ہے۔ مگر جبکہ یہ آدمی ہمارا بادشاہ ہوگیا تو ہرگز راضی نہ کیا جا سکے گا مگر جب کہ اللہ کی عبادت ویسے ہی ہوتے نہ دیکھے جیسے موسیٰؑ نے لکھی ہے۔''

جس قوم کی یہ حالت ہو چکی ہو وہ اگر تباہی اور بربادی کے رسوا کن عذاب میں مبتلا نہ ہوتو اور کیا ہو؟ نبی اکرمؐ کے دور رحمت مآب میں ان کے لئے پھر ایک موقعہ آیا تھا کہ نظام خداوندی کے اتباع سے شرفِ انسانیت کی سعادت حاصل کر لیں لیکن انہوں نے اپنی ضد اور قساوتِ قلبی کی بناء پر اس دعوت کی بھی انتہائی مخالفت کی اور بالآخر جزیرۃ العرب سے نکال دیئے گئے (قرآن کریم نے اس کا ذکر (۵۹/۲) میں کیا ہے) اس کے بعد یہ قوم ''آوارہ گرد یہودی'' (Wandering Jews) کے نام سے دنیا میں مشہور ہوئی تا آنکہ اب بعض طاقتور سلطنتوں کے سیاسی مصالح نے ان کے لئے فلسطین میں ''گھر'' بنا دیا ہے۔ (چونکہ یہ حصہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم اس مقام پر اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے)۔

اس مقام پر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ یہودیوں کے ہاں مذہب نسلی (قومی) تھا۔ یعنی یہودی وہی ہوسکتا تھا جو یہودیوں کے گھر پیدا ہو۔ کوئی غیر بنی اسرائیلی یہودی مذہب اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ صرف یہ ایک بات ہی اس امر کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ مذہب قطعاً وہ نہیں تھا جو ان کے انبیائے کرام کو خدا کی طرف سے ملا تھا۔ خدا کا دیا ہوا دین تمام نوع انسانی کے لئے ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ساحرین دربار فرعون حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے ہیں تو آپ نے انہیں یہ کہہ کر رد نہیں کر دیا کہ خدا پر ایمان صرف بنی اسرائیل کے لئے ہے۔ تم اس دین میں داخل نہیں ہو سکتے۔ لیکن بعد میں یہودیوں نے اسے قومی دین بنا لیا۔

(بنی اسرائیل کے متعلق مزید تفصیل کتاب ''برق طور'' میں ملے گی)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلی قسط

ثریا کوثر قیصرانی

گوہر ہائے آب دار

(علامہ پرویزؒ کے خطوط سے اقتباسات)

محترمہ بلند اختر (بیگم رضا علی) قرآن کریم کی طالبہ ہیں۔ان کا شمار علامہ پرویز کے اولین شاگردوں میں سے ہوتا ہے۔کراچی میں سکونت پذیر ہونے کی وجہ سے ان کا علامہ پرویز سے رابطہ بذریعہ خط وکتابت زیادہ رہا۔انہیں ذاتی مسائل پر بھی علامہ پرویز سے مشورہ کرنا ہوتا تو خط لکھ دیا کرتیں۔آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ نجی نوعیت کے ان خطوط میں بھی مفکر قرآن نے علم وحکمت کے موتی پرو دیے ہیں۔ان کی اہمیت کے مدنظر محترمہ بلند اختر کے نام علامہ پرویز کے خطوط سے اقتباسات کی پہلی قسط افادہ عام کے لئے پیش خدمت ہے۔

''میں نے اپنی تقریر میں کیریکٹر کے سلسلے میں ایسی چھوٹی چھوٹی مثالوں کو پیش کیا تھا جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں سامنے آتی ہیں۔کسی بڑی مثال کو پیش کیا جائے تو لوگ یہ کہہ کر اپنا اطمینان کر لیتے ہیں کہ اس قسم کی قربانیاں بڑے بڑے لوگوں کی طرف سے ہی پیش کی جاسکتی ہیں۔یہ ہم جیسے عام لوگوں کے بس کی بات نہیں۔یہ وجہ ہے کہ ہم اس قسم کی بلند ترین قربانیوں کا چرچا تو عام کرتے رہتے ہیں لیکن اس قسم کی قربانی کے لئے اپنے آپ کو کبھی آمادہ نہیں پاتے' میں اپنی قوم کی اس نفسیات سے واقف ہوں''۔(۱۵/۱۱/۶۷)

☆☆☆

''آپ کی چھوٹی بچی جو ابھی نو سال کی ہے اسے روزہ نہ رکھائیں۔ہمارے بچے۔۔۔بالخصوص کراچی میں۔۔پہلے ہی کمزور سے ہوتے ہیں پھر اتنی چھوٹی عمر میں ان پر روزے کا اثر خاصا پڑتا ہے۔ویسے انہیں روزے کی اہمیت بتاتے رہنا چاہئے اور کہنا چاہئے کہ جب وہ بڑے ہوں تو اس کی پابندی ضرور کریں۔''

''قرآن کریم کو ہمیشہ سمجھ کر پڑھنا چاہئے۔بلا سمجھے صرف الفاظ دہرا دینے سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ایک ماہ میں اس طرح پورا قرآن ختم کرنے کی بجائے اگر معنی اور مطلب کے ساتھ تھوڑا بھی پڑھا جائے تو وہ زیادہ اچھا ہے۔(۲۴/۱/۶۴)۔

☆☆☆

''بعض کام ایسے ہوتے ہیں جنہیں اگر ساتھی میسر نہ بھی ہوں تو ایک شخص تنہا بھی انہیں ایک حد تک کر سکتا ہے۔جیسے میرا لکھنے پڑھنے کا کام۔اگر ساتھی مل جائیں تو کام بھی جلدی ہو جاتا ہے اور اشاعت کی وسعت بھی بڑھ جاتی ہے۔لیکن اگر ساتھی نہ ہوں تو وقت اور محنت زیادہ صرف کر کے میں اسے تنہا ہی کر لیتا ہوں۔آپ کے پیش نظر جو اسکیم ہے اس میں اگر دیانتدار ساتھی نہ ملیں تو آپ سے تنہا وہ سکیم نہیں چل سکے گی اور نقصان بھی بڑا ہوگا۔بہر حال اس کے باوجود اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کی اسکیم کا ذکر طلوع اسلام میں کر دیا جائے تو ایسا ہو جائے گا۔وہ اسکیم آپ کے نام سے شائع کی جائے گی اور طلوع اسلام اپنی طرف سے اس پر کچھ نہیں لکھے گا۔(۲۱/۱/۶۵)۔

☆☆☆

''اگر آپ کا ملازم یہ کام اپنے فارغ وقت میں کرتا ہے۔۔یعنی جتنے وقت کے لئے آپ نے اسے ملازم رکھا ہو اس سے الگ' اپنے وقت میں۔۔تو پھر اسکی اس محنت سے کچھ لینے کا آپ کو حق نہیں پہنچتا۔باقی رہا یہ کہ آپ کی دکان میں آنے والے گاہک اسے یہ آرڈر دیتے ہیں تو اس سے آپ اس کے شکریہ کے مستحق تو ہو سکتے ہیں' اس کی محنت کے حصہ کے نہیں۔میں اپنی بصیرت قرآنی کے مطابق یہی سمجھتا ہوں۔''(۲/۸/۶۶)۔

☆☆☆

''قرآنی فکر کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے آپ کا طریق بہت عمدہ ہے۔اس کا انداز ہی یہ ہے کہ انسان اس بیج کو بکھیرتا جائے۔ جہاں جہاں زمین صالح ہوگی اس میں سے کونپل ضرور پھوٹ نکلے گی لیکن شروع ہی میں ''مفہوم القرآن'' کا پارہ دینے کی بجائے کوئی کتاب دینی چاہئے مثلاً (دوسروں کی ذہنی سطح کے مطابق) کسی کو ''اسباب زوال امت'' اور کسی کو ''اسلام کیا ہے'' اور بچوں کو ''اسلامی معاشرت''۔(۶۶/۱۱/۳۰)۔

☆☆☆

''آپ کا خط ابھی ابھی ملا۔ اور چونکہ آپ نے اس میں اپنی ایک خلش کا لکھا ہے اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس کا جواب فوری لکھ دیا جائے۔جس معاملہ کا آپ نے ذکر کیا ہے اس میں آپ مترفین کے زمرے میں نہیں آتیں۔ ناجائز یہ ہے کہ آپ صرف روپیہ لگائیں اور محنت سب کی سب دوسرے کریں اور آپ اس کے ماحصل میں شریک ہو جائیں جس صورت میں آپ خود بھی محنت کرتی ہیں تو یہ آپ کی محنت کا معاوضہ ہے۔آپ اس کام کو جس قدر ہو سکے بڑھاتے جائیں۔اس میں بہت سوں کا بھلا ہوگا اور آپ کو ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہو جائے گا کہ آپ میں (Self Confidence) پیدا ہو جائے گا۔''(۶۸/۸/۲)۔

☆☆☆

''موت سے آپ نے جو تاثر لیا ہے وہ وقتی جذبات کا نتیجہ ہے۔قرآنی تعلیم کی رو سے ایسا تاثر نہیں لینا چاہئے' موت تو ایک کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں منتقل ہو جانے کا نام ہے' زندگی مسلسل آگے چلتی ہے۔ یہ درست ہے کہ ہمیں موجودہ زندگی اس طرح بسر کرنی چاہیے کہ ہم اگلی منزل میں سرخرو ہو کر داخل ہوں اور اس کے لئے' اس سے بڑا نیک عمل اور کیا ہے کہ انسان نہ اپنے آپ کو دھوکا دے اور نہ کسی دوسرے کو اور جس قدر ہو سکے انسانیت کے منفعت کے کام کیے جائیں' خود ہمارے اردگرد بہت سے محتاج اور نادار مدد کے مستحق ہوتے ہیں' جس قدر ہم سے بن پڑے' ان کی مدد کی جائے۔ بے شمار غریب ایسے ہیں جن کی لڑکیوں کو شادی کے وقت بھی کوئی اچھا جوڑا نہیں ملتا' اگر کوئی اچھا کپڑا فالتو ہو تو ایسی لڑکیوں کو دے دینا چاہیئے' وہ ان کے کام بھی آتا ہے اور ان کی خوشی بھی پوری ہو جاتی ہے۔(۶۸/۱۱/۱۱)

☆☆☆

گھر میں خوشگواریٔ تعلقات گھر کو جنت بنا دیتی ہے' اس کا خاص خیال رکھنا چاہیے اور بجز ان باتوں کے جہاں کسی مستقل قدر پر زد پڑتی ہو' دوسروں کی خوشی کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔''(۶۸/۱۱/۱۱)۔

☆☆☆

''اس میں شبہ نہیں کہ ملک کے حالات بڑے پریشان کن ہیں لیکن میں تو مایوس ہونے اور ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں اپنی سی کیے جا رہا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ میری آواز ضروری مقامات تک پہنچ جائے۔ اس سے زیادہ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس قدر پریشانیوں کے باوجود میں اچھا ہوں اور اپنے کام میں بدستور مصروف!''(۶۹/۳/۱۸)۔

☆☆☆

''بیوہ کا یہ حصہ اس صورت میں ہے کہ اس کے بیٹے کمانے والے موجود ہوں اور بیوہ کے سر پر کسی قسم کی کوئی ذمہ داری نہ ہو۔ اگر وہ بے سہارا رہ جاتی ہو تو پھر وصیت کے ذریعے اسے سارے کا سارا ترکہ دیا جا سکتا ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں موجودہ حصے بتائے جاتے ہیں' اور ان کی رو سے متوفی کے بھائی' خواہ مخواہ وراثت لے جاتے ہیں۔ یہ قرآن کی رو سے نہیں ہے' یہ انسانوں کا وضع کردہ مذہب ہے۔'' (۶۹/۳/۱۸)۔

☆☆☆

''بچیوں کو اس کی عادت ڈالیں کہ وہ اپنے پیسوں ہی سے بھلائی کے کاموں کے لئے کچھ خرچ کیا کریں۔اس سے دل میں کشاد پیدا ہوتی ہے اور بہت سی اچھی صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔'' (۶۹/۹/۱۳)۔

☆☆☆

''آپ کا مفصل خط میرے سامنے ہے۔اس بارے میں میں نے اپنے خیالات کا اظہار آپ سے کر دیا تھا۔آپ کا جذبہ بڑا صادق اور نیت بڑی بخیر ہے۔لیکن اس اسکیم میں کامیابی مشکوک ہے۔ ایک تو اس لئے کہ گداگری کا انسداد صرف ملک کے معاشی نظام کو بدلنے سے ہوسکتا ہے اور دوسرے اس لئے کہ آپ کو مخلص رفیق اور کارکن مشکل مل سکیں گے۔اور مجھے ڈر ہے کہ اس کا تلخ تجربہ آپ پر مایوسی نہ طاری کر دے۔

بایں ہمہ اگر آپ پسند کریں تو ایسا کیا جا سکتا ہے کہ آپ کی اس اسکیم کا ملخص طلوع اسلام میں دے دیا جائے اور یہ لکھ دیا جائے کہ جو لوگ اس اسکیم سے متفق ہوں اور آپ کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیں وہ آپ سے براہ راست خط و کتابت کریں یا مل لیں۔آپ کا جواب آنے پر اگلے پرچے میں اسے دیا جا سکتا ہے۔'' (۱۹/۱۲/۶۹)۔

☆☆☆

''خدا کی راہنمائی کی تو ضرورت ہی اس وقت پڑتی ہے جب انسانوں کو درمیان سے ہٹا دیا جائے۔خدا کی راہنمائی وحی کے ذریعے نبی کو ملی اور ہمارے پاس وہ راہنمائی قرآن کریم میں اپنی اصل شکل میں موجود ہے' جس سے ہر شخص براہ راست مستفید ہوسکتا ہے۔ اس کے لئے کسی انسان کی محتاجی کی ضرورت نہیں۔عیسائیوں کو تو پادریوں کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ ان کے ہاں خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں اور جو کتاب موجود ہے اس میں زندگی کے عملی معاملات کے متعلق کوئی راہنمائی نہیں ملتی۔

یہی کیفیت دنیا کے ہر اہل مذہب کی ہے۔یہ خصوصیت تو صرف مسلمانوں کو حاصل ہے کہ ان کے پاس ایسی کتاب ہے جو زندگی کے ہر معاملے میں راہنمائی دیتی ہے۔'' (۲۷/۲/۷۰)۔

☆☆☆

''میں اگر قرآن کریم کو کچھ سمجھ سکا ہوں تو یہ بہ توفیق ایزدی ہے اور جو شخص قرآن کریم سے کچھ بصیرت حاصل کرے' اس کا فریضہ ہو جاتا ہے کہ وہ پھر اسے دوسروں تک بھی پہنچائے۔اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس کی توفیق بھی عطا کر دی ہے۔'' (۲۵/۱/۷۱)۔

☆☆☆

''اس میں شبہ نہیں کہ بچوں کے ذہن میں شروع ہی سے صحیح باتیں ڈالنی چاہیں لیکن اس کا طریقہ یہ نہیں کہ ان کے سوالوں کا جواب ان کے رسالے میں دیا جائے۔اس کے لئے تو مسلسل تعلیم اور بڑی تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہو گی۔دو چار فقروں میں جواب دینے سے بات اور بھی الجھ جاتی ہے۔اس سوال کا جواب تو آسانی سے دیا جا سکتا ہے کہ فجر کی نماز میں کتنی رکعتیں پڑھنی چاہیں لیکن جب وہ یہ پوچھ لیں کہ یہ کیوں پڑھنی چاہئیں تو آپ اس کا جواب چند فقروں میں کس طرح دے سکیں گی۔اس لئے میں اس سلسلے کو مفید نہیں سمجھتا' ویسے بھی میرے پاس اس کے لئے وقت کہاں ہوگا اور میں نے جب ایک دفعہ بات چھیڑ دی تو مجھے پھر آخر تک نبھانا ہوگا اور ان جوابات کی جو مخالفت ہوگی اسے یہ بیچارے رسالے والے کیسے برداشت کر سکیں گے۔اس لئے آپ انہیں بات سمجھا دیں۔'' (۱۶/۲/۷۱)۔

☆☆☆

''قوم کا حساس طبقہ مختلف تجارب سے مایوس ہو چکا ہے لیکن مستقبل کی طرف سے ابھی ناامید نہیں۔وہ زندگی کے دوراہا پر کھڑا ہے' منزل پر پہنچنے کی تڑپ بھی دل میں ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ صحیح راستہ کونسا ہے۔اسی کے لئے وہ ہمہ تن سوال بنا ہوا ہے۔یہ کیفیت اس وقت ہمارے ہاں ہر اس نوجوان کی ہو رہی ہے جو سرکش نہیں ہوا اور نہ ہی زندگی کی طرف سے لاتعلق ہو گیا ہے۔'' (۲۱/۹/۷۱)۔

☆☆☆

''آپ نے بہت اچھا کیا کہ کسی سکول میں بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا' بچوں کی معصوم رفاقت' انسان کے دل کے نرم و نازک گوشوں میں شگفتگی پیدا کر دیتی ہے' اور یہ انسانی ذات کی نشوونما کے لئے نہایت ضروری ہے اور پھر بچوں کو اگر ہم صحیح تعلیم اور تربیت دے سکیں تو یہ انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہوتی ہے۔آپ اس کا وہاں عملی تجربہ حاصل کر لیں۔'' (۲۳/۴/۷۲)۔

〈جاری ھے〉

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی محمد چدھڑ

صِرَاطِ مُستَقِیم

قرآن حکیم نے جس روش زندگی کی طرف انسان کی راہنمائی کی ہے۔ اسے صراط مستقیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۱/۵) یعنی سیدھی اور توازن بدوش راہ۔ یہ چیز ایک عظیم حقیقت کی طرف دلالت کرتی ہے۔ قرآن حکیم سے پہلے ارباب فکر اور اہل مذہب زندگی کی حرکت کو دَوری تسلیم کرتے تھے۔ حکمائے یونان نے جب یہ دیکھا کہ آسمان کے مختلف کرے گول ہیں تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ مقصودِ فطرت دائرہ ہے۔ سیدھا چلنا نہیں۔ اس اعتبار سے انہوں نے سب سے پہلے یہ نظریہ ایجاد کیا کہ کائنات کی حرکت دوری ہے۔ یعنی وہ ایک متعین دائرے میں گردش کر رہی ہے آگے نہیں بڑھ رہی۔ اس سے فیثا غورس نے تناسخ کا نظریہ قائم کیا۔ یعنی یہ نظریہ کہ انسانی روح جون بدل بدل کر بار بار اس دنیا میں مختلف قالبوں میں آتی ہے۔ روح کو اس چکر سے نجات مل جانا مقصود حیات ہے۔ یہی تصور ہندوؤں کے فلسفہ کی بنیاد ہے۔ اور اسی پر ان کے تصوف (یوگ) کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یعنی انسانی روح درحقیقت اللہ کی روح (آتما) کا ایک جزو ہے۔ جو اپنی اصل سے جدا ہو کر زندگی کے چکر میں پھنس چکی ہے۔ اس کا ان چکروں سے آزادی حاصل کر لینا اور پھر سے اپنے کل سے جا ملنا مقصود زندگی ہے۔ یہی تصور مجوسیوں کے ہاں پایا جاتا ہے۔ اور اس سے وحدت الوجود کا نظریہ مستعار لیا گیا ہے۔ جو ہمارے ہاں تصوف کی بنیاد ہے۔ یہی عیسائیت اور یہودیت میں ملتا ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسان کا بچہ اول ماں باپ آدم وحوا کا گناہ پیدائشی طور پر اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اگر وہ حضرت مسیح کے کفارہ پر ایمان لے آتا ہے تو وہ گناہ سے دھل جاتا ہے اور وہ جنت میں چلا جاتا ہے۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے اسلاف سے جو چند دنوں کے لئے گوسالہ پرستی کی غلطی ہوگئی تھی اس کی پاداش میں انہیں چند دنوں کے لئے جہنم میں جانا پڑے گا اس کے بعد ان کی شفاعت ہو جائے گی۔

آپ نے دیکھا کہ ان تمام نظریات کا ماحصل یہ ہے کہ انسانی زندگی کا منتہا اور مقصود وہ کچھ ہو جانا ہے کہ جو وہ پہلے تھی یعنی اس میں آگے بڑھنے یا ترقی کرنے کا سوال نہیں As you were ہو جانا مقصود حیات ہے۔ دوری حکرت سے یہی مراد ہے۔ یعنی ایک دائرے میں گردش کرتے ہوئے جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ جانا۔

قرآن حکیم نے ارباب فکر اور اہل مذہب کے نقطہ نظر کی تردید کی اور کہا کہ زندگی کو ہلو کے بیل کی طرح ایک جگہ گھومنے کا نام نہیں۔ آگے بڑھنے اور بلند ہونے کا نام ہے اللہ کائنات کو صراط مستقیم پر لے جا رہا ہے۔ ربی علیٰ صراط مستقیم (۱۱/۵۷) اس میں نت نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں یزید فی الخلق ما یشاء (۱/۳۵)۔ اور انسان کو صراط مستقیم پر چلنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں زندگی کی ممکنات ودیعت کر دی گئی ہیں اور جدوجہد کا وسیع میدان دے دیا گیا ہے۔ جو کوئی قوانین خداوندی کے مطابق زندگی

بسر کرے گا۔ اس کی ممکنات مشہود ہوتی جائیں گی اور وہ سفر زندگی میں آگے بڑھتا جائے گا۔ اس طرح اس کا سفر دائرے میں نہیں بلکہ سیدھے اور متوازن راستے پر ہوگا۔ اور اس کی زندگی کی سطح بلند ہوتی جائے گی اور وہ ارتقا کی منازل طے کرتا آگے بڑھتا جائے گا۔ تم ضرور منزل بہ منزل درجہ بدرجہ بلند ہوتے جاؤ گے (۸۴/۲۰)۔ اس لئے کہ اللہ صراط مستقیم ہی کا مالک نہیں وہ ذی المعارج بھی ہے (۷۰/۲۰)۔ یعنی سیڑھیوں والا بلندیوں کی طرف لے جانے والا۔ لہٰذا قرآن کریم کی رو سے زندگی کا منتہیٰ (As you were) نہیں بلکہ ارتقائی منازل طے کر کے آگے بڑھتے چلے جانا ہے کائنات میں اللہ تعالیٰ کا قانون ارتقاء کارفرما ہے۔

زندگی کی دوری حرکت کا تصور عہد کہن کے انسانی ذہن کا مغالطہ نہیں اس زمانے میں جہاں انسانی فکر نے وحی سے روشنی نہیں لی وہ بھی اسی چکر میں پھنس گیا ہے۔ جرمنی کے مشہور فلاسفر نیٹشے کا تکرار ازلی کا نظریہ اسی مغالطہ کا رہین منت ہے۔ ہیگل Hegal کا نظریۂ اضداد بھی اسی کا مظہر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں تصور (idea) پیدا ہوتا ہے، پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ اپنے شباب کو پہنچتا ہے تو اس میں اس کی ضد دوسرا نظریہ پیدا ہو جاتا ہے جو پہلے نظریہ کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر جب دوسرا نظریہ پروان چڑھتا ہے تو اس میں سے اس کی ضد پیدا ہوتی ہے۔ ہیگل کے متبع مارکس نے کہا کہ یہ چکر تصورات میں ہی نہیں بلکہ نظامہائے زندگی میں بھی کارفرما ہے۔ دنیا میں ایک معاشی نظام پیدا ہوتا ہے۔ جو پہلے نظام کے لئے پیغام مرگ بن جاتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری ہے۔ پہلے نظام سرمایہ داری کا دور تھا جب وہ نظام شباب تک پہنچ گیا تو اس میں سے اس کی ضد نظام اشتراکیت پیدا ہو گیا۔ اب اس کی باری ہے۔

آپ نے غور کیا کہ تنہا عقل انسانی نے جب بھی زندگی کے متعلق کوئی تصور قائم کرنا چاہا ہے۔ تو اس نے اس میں کس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ یہ صرف وحی کی روشنی ہے جو انسان کو صحیح نظریۂ زندگی عطا کر سکتی ہے۔ چنانچہ وحی نے اس سلسلہ میں جو نظریہ دیا وہ صراط مستقیم ہے۔ یعنی نہ ایک مقام پر کھڑے ہو کر جامد اور متصلب ہو جانا اور نہ ہی دائرے میں گردش کرتے رہنا۔ بلکہ زندگی کے سیدھے اور متوازن رستے پر چلتے جانا اور اس طرح آگے بڑھتے چلے جانا۔ ''حرکت اور ارتقاء'' یہ ہے قرآنی نظریہ زندگی کا ماحصل۔ جسے اس نے 'صراط مستقیم' سے تعبیر کیا ہے۔

اس اہم ترین اور عظیم اصطلاح کے پیش نظر دل چاہ رہا ہے کہ ان آیات قرآنی کے مفہوم سے قارئین کو بھی متعارف کرا دیا جائے جو اللہ کے قانون کے ذریعہ صراط مستقیم یعنی سیدھے اور متوازن راستہ کی طرف انسان کی راہنمائی کرتی ہیں۔

(۱) اللہ صراط مستقیم پر ہے۔

بلاشبہ میرا پروردگار صراط مستقیم پر ہے۔ (۱۱/۵۶)۔

(۲) تمام انبیاء کرام صراط مستقیم پر تھے۔

اور تمام انبیاء کرام کو ہم نے راہنمائی دی۔ صراط مستقیم کی طرف۔ (۶/۸۸)۔

(۳) نبی آخرالزمان کے صراط مستقیم پر ہونے کی شہادت۔

قسم ہے قرآن حکیم کی کہ تم بلاشبہ رسولوں میں سے ہو۔ سیدھی متوازن اور آگے کی طرف جانے والی راہ۔ (۳۶/۳۔۴)۔

(۴) قرآن صراط مستقیم کی طرف راہنمائی دیتا ہے۔

اب یہ روش قرآن کی راہنمائی ہی میں مل سکتی ہے۔ جس سے زیادہ توازن بدوش سیدھی راہ اور کوئی نہیں (۹/ ۱۷)۔

اور میرے قوانین کا اتباع کرو۔ یہی صراط مستقیم ہے۔ (۴۳/۶۱)۔

(۵) اللہ کی طرف سے دی گئی روشنی ہی صراط مستقیم کی راہنمائی کرتی ہے۔

اللہ کی جانب سے تمہاری طرف روشنی آ گئی۔ یعنی ایک کھلا ہوا واضح ضابطۂ قوانین۔ جس کے ذریعہ اللہ ہر قوم کو سلامتی کی راہ دکھاتا ہے۔ جو اپنی زندگی کو قوانین خداوندی سے ہم آہنگ رکھے وہ انہیں جہالت اور گمراہی کی تاریکیوں سے نکال کر اپنے قوانین کی روشنی میں لے آتا اور انہیں متوازن روش زندگی کی طرف راہنمائی دیتا ہے۔ (۵/۱۵۔۱۶)۔

(۶) اللہ کے قوانین کے ذریعہ صراط مستقیم نصیب ہوتی ہے۔

اور یہ توازن بدوش راہ تمہارے پروردگار کی راہ ہے۔ جس کے لئے اس نے قوانین واضح طور پر بیان کر دیئے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو انہیں پیش نظر رکھنا چاہیں۔ انہیں پروردگار کی جانب سے ہر طرح کی سلامتی نصیب ہو جاتی ہے۔ اور وہ ان کا رفیق و مددگار بن جاتا ہے۔ ان کے حسن عمل کے نتیجہ میں۔ (۶/۱۲۷۔۱۲۸)۔

(۷) صراط مستقیم سلامتی کی روش ہے۔

جس روش کی جانب اللہ دعوت دیتا ہے۔ وہ سلامتی کی روش ہے اور جو کوئی راہنمائی حاصل کرنا چاہے اسے پروردگار کا قانون اس متوازن روش زندگی کی طرف راہنمائی دیتا ہے۔ (۱۰/۲۵)۔

(۸) چاہے اللہ کے قوانین سے صراط مستقیم کی طرف۔

ہم نے نہایت ہی واضح انداز میں اپنے قوانین نازل کر دیئے ہیں۔ اب جو کوئی ان سے راہنمائی حاصل کرنا چاہے تو یہ اس کی راہنمائی متوازن روش زندگی کی طرف کر دیں گے۔ (۲۴/۴۶)۔

(۹) جو قوم بھی چاہے صراط مستقیم کی طرف راہنمائی پا سکتی ہے۔

یہ ضابطہ قوانین تمام نوع انسان کے لئے ہے۔ لہٰذا تم میں سے جو قوم بھی چاہے۔ اس کے ذریعہ سے زندگی کی متوازن اور سیدھی راہ پر چل سکتی ہے۔ (۸۱/۲۷۔۲۸)۔

(۱۰) جو لوگ اللہ کے اس روشن اور تابناک ضابطہ ہدایت کو اپنا نصب العین بنا لیں تو ان پر معاشی خوش حالیوں اور سہولتوں کے دروازے کھل جائیں گے اس طرح وہ سیدھی اور متوازن راہ پر چل نکلیں گے جو انہیں بلاخوف و خطر ان کی منزل مقصود تک لے جائے گی۔ (۴/۱۷۶)۔

(۱۱) اے جماعت مومنین یاد رکھو جس نے اس کتاب اور نظام خداوندی کے مرکز کو محکم طور پر اپنا لیا۔ تو اسے یقیناً زندگی کی سیدھی اور متوازن راہ کی طرف راہنمائی مل جائے گی۔ (۳/۱۰۰)۔

اور آخر میں یہ دعا۔

پروردگار ہماری راہنمائی فرمائیے
سیدھی اور متوازن روش زندگی کی طرف
ان لوگوں کی روش زندگی کی طرف
جو آپ کے انعامات کے مستحق ہوئے
پروردگار ہم ان گمراہیوں کی روش سے بچنا چاہتے ہیں
جو آپ کے قانونِ مکافات کی گرفت میں آ گئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پروفیسر سید اعجاز احمد

لفظوں کے کھیل میں یومِ آزادی

علامہ پرویزؒ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''جب تک اصطلاحات کے مفاہیم و معنی کا تعین ٹھیک ٹھیک طرح سے نہ کر لیا جائے اتنی دیر تک ان سے متعلقہ مطالب و مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔''

زندگی کا کوئی بھی شعبہ اور میدان ہو اس کی عملی خصوصیت اور پر معنی کارکردگی کو ظاہر کرنے کے لیے جن الفاظ و معنی کا استعمال کیا جاتا ہے ان کی مدد سے ہی ہم دوسروں تک اس شعبہ کی افادیت کو منتقل کر سکتے ہیں۔

مختلف حروف کی باہمی ترتیب کا نام لفظ ہے یا مختلف حروف کے ملنے سے بامعنی الفاظ بنتے ہیں' بامعنی الفاظ کے مجموعے کا نام زبان ہے۔ بامعنی الفاظ ہمارے جذبات و احساسات اور خیالات کے ترجمان ہوتے ہیں۔

اصطلاحات الفاظ کے ایسے مرکبات کا نام ہے جن کی مدد سے تہذیبی و ثقافتی' تمدنی و عمرانی اور سائنسی و علمی مفاہیم و معنی کو آسانی کے ساتھ شعور حیات کے لیے آگے منتقل کیا جا سکتا ہے۔

لفظوں کی حرکات و سکنات اور حروف کی نشست و برخاست ماہرین لسانیات کے نزدیک بہت اہمیت رکھتی ہے۔ علم اور جانکاری کا کوئی شعبہ یا میدان ہو اس کے بیان اور اظہار کے لیے مخصوص الفاظ ہوتے ہیں۔ تاریخ کو معاشیات کی زبان میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح فزکس اور کیمسٹری کے لیے بھی زبان اور الفاظ کا استعمال الگ الگ کیا جاتا ہے۔ ماہرین ادبیات و لسانیات کے مطابق ہتھیاروں کا غلط استعمال نوع انسانی کے لیے اتنا نقصان دہ ثابت نہیں ہوتا جتنا لفظوں کا غلط استعمال۔ انسان کی قوت گویائی کا انحصار الفاظ پر ہی ہے کیونکہ الفاظ کا بامعنی مجموعہ ہی زبان کہلاتا ہے۔

الفاظ ہی انسان کو نہ صرف دوسری مخلوقات سے بلکہ ایک دوسرے سے بھی ممتاز کرتے ہیں۔ انسان کا یہی امتیاز اور برتری اگر لفظوں کے غلط استعمال کی نذر ہو جائے تو انسان کی یہی کم نگہی اور حالات کو سمجھ سکنے کی نااہلیت اسے اس کے بالاتر استحقاق سے فارغ کر دے گی۔ علمی اور معاشرتی سطح پر لفظوں اور اصطلاحات کا غلط استعمال سہواً نہیں بلکہ ایک سازش کے تحت کیا جاتا ہے یا کرایا جاتا ہے۔ خطرناک صورت حالات اس وقت پیدا ہوتی ہے جب لفظوں اور اصطلاحات کا غلط استعمال ایک مخصوص طبقہ یا چند طبقات کے مفادات کے دفاع اور تحفظ کی خاطر انٹیلی جینشیا کی نذر ہو جائے۔ انٹیلی جینشیا وہ بلائے بد ہے جو جنت کو دوزخ اور دوزخ کو جنت بنا کر دکھا دیتا ہے اور لوگ بقول ہٹلر کے راضی راضی جنت چھوڑ کر جہنم میں داخل ہو جاتے ہیں۔

اصطلاحات اور لفظوں کا غلط اور مذموم استعمال زندگی کے دو شعبوں یا میدانوں میں سب سے زیادہ کیا جاتا ہے۔ ان دونوں شعبوں کا زندگی کی تخریب و تعمیر کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔

نمبر ایک پر سیاست کا شعبہ ہے۔ فی زمانہ جس کا مطلب ہی ریاکاری' مکر و فریب اور دھوکہ دہی کے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا۔ (سیاست رائج الوقت مسائل کو گہرے غور و خوض کے بعد بہتر حل پیش کرنے کا نام ہے۔ یہ وہ میدان ہے جو سب سے زیادہ طبقاتی مفادات کے تحفظ اور دفاع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ آج کل اجارہ دار طبقات نے مملکتی و ریاستی وسائل اور اقتدار اعلیٰ پر قبضہ کرنے اور مضبوط ہاتھ ڈالنے کی خاطر سیاست کو کمرشلائز کر کے اپنے مکروہ مفادات اور ترجیحات کو محفوظ کر لیا ہے۔ اور بذریعہ سیاست تمام تر عوامی اداروں اور ترجیحات کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے اور یہ تمام مقاصد ہتھیاروں نہیں بلکہ سوچی سمجھی سکیم کے تحت لفظوں اور اصطلاحات کے

غلط استعمال سے حاصل کئے گئے ہیں اور عوام بے چاری ان مقدس لفظوں کی بھینٹ چڑھ رہی ہے۔ کیونکہ لفظوں کا استعمال اس شاطرانہ انداز سے کیا جاتا ہے کہ سادہ لوح عوام کو ساری عمر پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہمارے ساتھ کیا کچھ ہو چکا ہے!

لفظوں اور اصطلاحات کے غلط استعمال کا دوسرا میدان' میدان جنگ ہے اور مثل مشہور ہے کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ جب سب جائز ہو تو ناجائز کی گنجائش ہی باقی کہاں رہ جاتی ہے خرد کا نام جنوں اور جنوں کا خرد پڑ جانے کی ابتدا بندوق کی پہلی گولی سے ہو جاتی ہے۔ انسانوں کی جانوں کے ضیاع کو ہتھیاروں کے تلف ہو جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ دشمن کی اتنی بندوقیں ٹینک یا توپیں ضائع ہو گئیں' وسیع تر تباہ شدہ علاقے اور لٹے پٹے انسانوں' تاراج شدہ گھروں اور جلی ہوئی لاشوں کی اطلاع ایڈوانس کرتے ہوئے جوانوں کی جرأت اور بہادری کے حوالے سے دی جاتی ہے۔ بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی دبی اور سسکتی ہوئی آہوں کو لفظوں میں سجا کر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ سننے والے اپنے جوانوں کی جرأت بے پایاں پر ناز کرنے لگتے ہیں۔ لفظوں اور اصطلاحات کا ایسا استعمال عقل فسوں کار کی کارستانی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مخالف کی ہر قسم کی وسیع اور مہیب تباہیوں اور بربادیوں کو لفظ شکست میں چھپا دیا جاتا ہے اور ہر قسم کی خون آشامیاں لفظ فتح کے نشے میں گرد ہو جاتی ہیں۔ یوں لفظوں اور اصطلاحات کا غلط استعمال اصلیت اور حقیقت سے ذہنوں اور جذبوں کو دور اور بہت دور لے جاتا ہے۔ اتنا دور کہ لفظوں کے حوالے سے اصل بات تک پہنچنا ناممکن ہو جاتا ہے' لیکن بعض ہمت والے لوگ جو صرف اور صرف ممکنات کے قائل ہوتے ہیں ناممکن کی سنگ لاخ چٹان سے بھی ٹکرا جاتے ہیں اور یوں لفظوں کی دبیز اور ٹھنڈی راکھ سے وہ چنگاری نکال لاتے ہیں بقول آتش۔

چشم معنی آشنا میں ہے مقام ان کا وہی
سہوئے کاتب سے مقدم ہوں موخر سینکڑوں

گیدڑ کو شیر سے بہادر اور طاقتور لکھ دینے سے اصلیت نہیں بدل جاتی۔

اس میں شک نہیں کہ لفظوں کے صدر و موخر کی اس جادوگری کو اگر میڈیا کے پر لگ جائیں تو آنکھوں کی پتلی بن کر بیٹھ جاتے ہیں اور وہ کچھ دکھائی دینے لگتا ہے جو کچھ وہ دکھانا چاہتی ہے۔ شائد رنگوں کی فریب نظری اسی کا نام ہے۔

قیام پاکستان کے بعد کی تاریخ سیاسی قلابازیوں کی تاریخ تو ہے ہی لیکن سب سے زیادہ جس چیز نے پاکستانی ذہن اور پاکستانیت کو متاثر کیا ہے وہ پاکستان کی تاریخ وثقافت سے متعلقہ الفاظ اور اصطلاحات کا غلط استعمال ہے۔ قومیں جب اپنے سیاسی' فکری اور نظریاتی تشخص کے عبوری دور سے گزر رہی ہوتی ہیں اس وقت ان کی لغت معروضی سے زیادہ تجریدیت پر مبنی ہوتی ہے۔ کیونکہ عبوری دور ہمیشہ حقوق وفرائض سے آگاہی' اپنے مفادات اور ملکی وقومی ترجیحات کے تعین کا دور ہوتا ہے۔ خاص طور پر اپنے جداگانہ تشخص کے لیے برسر پیکار اقوام وافراد کا ذہنی المیہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے اکثر الفاظ اور اصطلاحات ابہام کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اور مخالف قوتیں انہیں اپنے من مرضی کے معنی پہنانے کی کوشش کرتی ہیں یہی وہ دور ہوتا ہے جب کسی دانائے راز قائد اور تحریک کے مخلص کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر لفظوں اور اصطلاحات کے خزانے کو قومی ورثہ جان کر محفوظ کر لیا جائے تو دزدیدگی کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں اور وہ چرب زبان لوگ جو دن کے روشن چہرے پر لفظوں کی سیاہی مل دینا چاہتے ہیں شاید وہ ایسا نہ کر سکیں۔

ہماری سیاسی' سماجی اور ذرائع ابلاغ کی تاریخ میں سب سے زیادہ لفظوں کی مار پاکستان کو پڑی ہے۔ اس مار نے پاکستان کے روشن اور سندر چہرے کو مسخ کر دیا ہے۔ تاریخ کا ادنیٰ سا طالب علم بھی جانتا ہے کہ حصول پاکستان تک کی تاریخ یا دور کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۶ء تک دوسرا ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۰ء تک تیسرا دور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک اور چوتھا دور ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا ہے۔

ان چار حصوں میں اسلامیان ہند کی تنظیمی و سیاسی

سرگرمیوں سے قطع نظر مقاصد و مفادات اور تشخص کو اجاگر کرنے اور پہچاننے کا سلسلہ سرفہرست رہا ہے۔ اگر مجموعی طور پر ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک دیکھا جائے تو یہ دور ہندو مسلم مفادات کی یکسانیت کا دور تھا۔ دونوں گروہوں کے سامنے آزادی ہند کا مقفل باب تھا اور تحریک آزادی ہند کو دونوں قوموں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ نے کبھی بھی تحریک آزادی ہند کے ساتھ تحریک آزادی پاکستان کو مشروط قرار نہیں دیا تھا۔ کیونکہ اسلامیان ہند نے کبھی بھولے سے بھی پاکستان کے بارے ابھی تک نہیں سوچا تھا۔ مسلمان زعماء قائداعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت میں مسلمانوں کے حقوق و واجبات کے تعین پر زور دیتے رہے۔ مسلمانوں نے متحدہ ہندوستان میں رہتے ہوئے اپنے لئے سیاسی اور سماجی حقوق کے حصول کے لئے ضمانت طلب کی تو جواب میں جمہوری طرز حکومت کی نوید جانفزا سنائی گئی۔ مسلمانوں کے قائد محمد علی جناحؒ اس دامِ ہم رنگِ زمیں کو اچھی طرح پہچانتے تھے لہٰذا آپ نے اس خطرناک جمہوری چال کو اپنے تدبر سے ناکام بنا دیا اور مسلمانوں کے لیے جداگانہ حیثیت کا مطالبہ کرتے رہے۔

جب ہندو کی ہٹ دھرمی حد سے زیادہ بڑھ گئی اور مسلمانوں کے تمام جائز مطالبات کو، جو متحدہ ہندوستان میں رہتے ہوئے پورے کئے جانے تھے، رد کر دیا تو علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے مسائل کا آخری اور حتمی حل پاکستان کا نام لئے بغیر ۱۹۳۰ء میں خطبہ الٰہ آباد میں پیش کر دیا۔ پھر اس کے بعد مسلمانوں نے اپنے اس نئے مطالبہ کو سیاسی، سماجی، منطقی اور فلسفیانہ بنیادوں پر سمجھنے سمجھانے پر سارا زور صرف کر دیا لیکن ہندو کی مکار ذہنیت نے اس سیدھے سادے اور جائز مطالبہ کو بھی سمجھنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ پھر ۱۹۴۰ء میں اس مطالبہ نے ایک علیحدہ خطۂ زمین کے حصول کے لئے نعرۂ مستانہ کی شکل اختیار کر لی، سات سالوں تک اس خاکہ میں رنگ بھرا جاتا رہا، آخر کار ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اس کارگہ عالم کی نمائش میں ایک اور دل آویز پورٹریٹ کا اضافہ پاکستان کے نام سے ہو گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ساری سیاسی، سماجی، مذہبی اور نظریاتی جدوجہد کے دوران کبھی بھی ایسے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے جو ابہام پیدا کرنے والے ہوں جب پاکستان حاصل ہو گیا یا بن گیا تو لفظوں کی ایسی جنگ کا آغاز کر دیا گیا جس کا وجود پاکستان کے ساتھ دور کا بھی تعلق واسطہ نہ تھا۔ میں یہ بات اصرار کے ساتھ کہوں گا کہ یہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت کہا گیا اور وہ الفاظ و صطلاحات جو پاکستان کی منزل تک پہنچنے کے لیے استعمال میں نہیں لائے گئے تھے استعمال میں آنے لگے پھر ان الفاظ و اصطلاحات کو حکومتی و مملکتی سرپرستی حاصل ہو گئی اور کسی نے بھی نہ سوچا کہ ان الفاظ و اصطلاحات کا ذہنی، تہذیبی و ثقافتی اور سیاسی و تحریکی پس منظر کیا ہو گا۔

حصول و تشکیل پاکستان کے فوراً بعد پاکستان کے وجودی اظہار کی ضرورت محسوس کی گئی اور ایک ایسی اصطلاح کو وضع کیا گیا جس کا نہ تو نظریہ پاکستان کے ساتھ کوئی تعلق تھا اور نہ ہی تحریک حصول پاکستان کے ساتھ یعنی ''یوم آزادی پاکستان'' یہ ایک ایسی اصطلاح تھی جس کو ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کبھی بھولے سے بھی استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ یہ بات یاد رہے کہ شعوری اور معروضی سطح پر تحریک پاکستان کا دور ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کا ہے۔

دنیا اس بات کی گواہ ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے دنیا کے نقشہ پر پاکستان نام کا کوئی ملک موجود نہیں تھا، پورے ملک کا نقشہ تو ایک طرف بساط عالم پر پاکستان کے حوالے سے ایک لائن بھی موجود نہیں تھی۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے اقوام عالم کی صفوں میں کسی ایسی قوم کا شمار نہیں تھا جو پاکستانی تہذیب و ثقافت کی علمبردار ہو یا اس کی پہچان پاکستان جیسے ملک کے نام کے حوالے سے ہو سکتی ہو۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے دنیا کی کسی جارح قوم نے جارحیت کا ارتکاب کرتے ہوئے پاکستانی قوم کو غلام بنا کر اس کے ملکی حدود اربعہ کو تبدیل نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی پاکستانی قوم کے وطن عزیز پر قابض ہو کر اس کے تشخص کو ختم کر دیا تھا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے دنیا میں کوئی ایسی مقتدر قوم یا ریاست موجود نہیں تھی جو اپنے اقتدار اعلیٰ کا دعوی مملکت پاکستان کے حوالے سے کر سکتی ہو۔

دنیا کے مختلف ایوان ہائے صنعت و تجارت اور سیاست اس بات کے گواہ ہیں کہ پاکستان نام کے ملک کو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کسی بھی ایسے ایوان میں بطور مندوب نمائندگی حاصل نہیں رہی تھی اور نہ ہی دنیا کی کسی آزاد و خود مختار قوم نے پاکستانی نامی قوم کو آزاد و خود مختار قوم کے حوالے سے کبھی تسلیم ہی کیا ہو۔ اسلامیان جنوبی ایشیا نے مختلف اوقات میں ہندوستان پر طویل مدت تک حکمرانی کی ہے یہ اہل ایمان کا ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر نکلے کا ایک انداز تھا جس طرح خارجی کائنات کو جو احکام و قوانین الہیہ کے مطابق سرگرم عمل ہے غلام نہیں بنایا جا سکتا اسی طرح اہل ایمان کو غلامی کی زنجیروں میں نہیں جکڑا جا سکتا' کیونکہ ان کا ذوق ایمان و یقین ایسی تمام زنجیروں کو توڑ دیتا ہے۔ ہندوستان پر مسلمانوں کی طویل حکمرانی کے بعد وقتی انحطاط عارضی پسپائی تھی اور اس پسپائی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں نے اپنے احیا کی جنگ اپنے طویل دور حکمرانی سے کہیں کم عرصے میں لڑ کر جیت لی۔ یہ قدرت کا کرشمہ ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا اور پھر انگریزوں نے ہندوستان کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ یوں ہندو کبھی بھی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے جدید اصطلاح میں آزاد و خود مختار ہندوستان کے حکمران نہیں رہے۔ بلکہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد بھی بطور ہندو حکمران کے ان کا خواب پورا نہیں ہو سکا اور یہ بے چارے بزور مکر و فریب (سیکولرازم) کے باجود ہندوستان پر حکومت کرتے ہوئے بھی اپنے آپ کو ہندو حکمران نہیں کہہ سکتے۔

ہندوؤں نے آزادی ہند کی جنگ کا آغاز کیا تو مسلمانوں نے ان کا ساتھ دیا لیکن جلد ہی مسلمانوں نے ان کے جذبہ تغلب کو بھانپ لیا اور یوں اپنے منفرد اسلامی تشخص کو مخدوش محسوس کرتے ہوئے پلٹ جھپٹ کر فضائے بسیط کو اپنی گرفت میں لے لیا اور یوں اسلامیان ہند اپنے تہذیبی و ثقافتی ورثہ کو طاقتور انداز میں محفوظ کرنے کے قابل ہو گئے اور بطن گیتی سے ایک نیا آفتاب طلوع ہوا جو پاکستان کہلایا۔ قبل ازیں پاکستان پر نہ انگریز کا قبضہ تھا نہ ہندو کا تسلط۔ پاکستان کے اقتدار اعلیٰ کا تعین پاکستان کی نظریاتی حدوں کے حوالے سے کیا گیا۔ اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی سیاسی نظریہ کا فروغ پاکستان کے وجود سے منسوب ہو گیا۔ پاکستان آزاد نہیں ہوا تھا کیونکہ پاکستان کسی کا غلام بھی نہیں تھا۔

لفظوں کی مار شروع ہوئی اور یوم آزادی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا جانے لگا۔ کسی نئی چیز کا قیام اپنا معنوی و منطقی وجود رکھتا ہے۔ اپنے وجود کو کھو دینا انتہائے بوسیدگی ہے۔ جو چیز پہلے سے موجود ہی نہ ہو اس کے لیے ایسے لفظوں اور اصطلاحات کا استعمال کرنا کہ جس سے اس کی معروضی و وجودی غایت ہی بدل جائے ایک اندوہناک سازش اور بدتر مقاصد کی تکمیل کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی اس کی غرض و غایت کو تبدیل کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ اس کے لیے حال کے لفظوں اور مستقبل کے تاریخی' ملکی اور قومی واقعات کو اس طرح سے ڈھالا جانے لگا کہ ان سے معاشرتی' سیاسی اور نظریاتی تخریب اور بگاڑ تو کمال کا ہو لیکن اقتدار کے ستون مزید سے مزید محفوظ و مضبوط ہوتے چلے جائیں۔ اس مقصد کے لئے یوم تشکیل پاکستان کو یوم آزادی سے بدل دینا پہلا قدم تھا۔

بعض حلقوں کی طرف سے یہ بات بڑے شدومد سے کہی جا رہی ہے اور کہی جاتی رہی ہے کہ پاکستان کو متعین شدہ اغراض و مقاصد کو حاصل کرنے سے دور لے جایا گیا ہے۔ لیکن آج تک اس جگہ اور مقام کی نشاندہی نہیں کی گئی جہاں خرابی موجود ہے۔ پہلی خرابی ہی یہ ہے کہ جو کام سرے سے ہوا ہی نہیں اس کا ڈھنڈورا پیٹا جائے۔ جو رات ڈھلی ہی نہیں اس کا قصہ سنایا جائے۔ جو آیا ہی نہیں اس کے جانے کا ذکر کیا جائے جو سویا ہی نہیں وہ بیدار کیسے ہو۔

بعض احباب سوچ سکتے ہیں کہ ''یوم آزادی پاکستان'' اور ''یوم تشکیل پاکستان'' میں کیا فرق ہے۔ فرق کیا پڑتا ہے اگر یوم

آزادی ہی منایا جائے۔ پھر یوم تشکیل پاکستان کے ساتھ کون سے جذبات اور کونسی امنگ وابستہ کی جائے۔ اس کے لئے کون سا تاریخی تہذیبی ثقافتی سیاسی اور تمدنی وتحریکی باب کھولا جائے کہ جس کو دیکھ کر یوم آزادی یکسر معدوم اور یوم تشکیل پاکستان اپنی تمام تر ترجیحات کے ساتھ ابھر کر سامنے آجائے۔ یوم آزادی منانے کی پرانی خوئے تکرار کو کس طرح بدلا جائے؟ یوم تشکیل کا نیا سبق کیسے پڑھا جائے؟ اتنی ڈھیر ساری پراپیگنڈا مشینری اور ذرائع ابلاغ کے منہ میں نئی زبان کیسے ڈالی جائے؟ اور پھر سب سے بڑا سوال کہ یوم آزادی کی جگہ نئی اصطلاح ''یوم تشکیل'' کو کیوں اپنایا جائے؟

آزادی اور غلامی دو ایسے الفاظ ہیں جن کے اپنے نفسیاتی اور عملی مفاہیم ہیں۔ دونوں کی اپنی اپنی ترجیحات ہیں۔ آزادی غلامی کا ردعمل یا لازمی نتیجہ ہے۔ غلامی کے بعد آزادی ایک خاص ماحولیاتی و نفسیاتی پس منظر کو پیش کرتی ہے۔ پاکستان کو غلامی کا پس منظر (خدانکردہ) ملا ہی نہیں ہے تو آزادی کا کیا مطلب۔ کسی چیز کی نئی تشکیل نئے عزم' نئی ترجیحات' بلند مقاصد اور نئے آدرشوں کی جانب قدم ہوتا ہے۔ جو بھی تشکیل نو ہوتی ہے وہ اپنے ساتھ بے شمار نئے جہانوں اور دنیاؤں کی نشاندہی کرتی ہے۔ پاکستان تشکیل نو ہے' اس کے سامنے غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی ترجیحات سے کچھ مختلف ترجیحات ہیں۔ پاکستان بخشی ہوئی فردوس نہیں بلکہ یہ خون جگر سے حاصل ہونے والی جنت ہے۔ اس جنت کو غلامی کے بعد حاصل ہونے والی آزادی کی گرد سے محفوظ رکھنا ضروری ہے!

وہ ریاستی و مملکتی ادارے اور حکومتی مشینری جو آج تک یوم آزادی مناتی چلی آئی ہے اس نے شاید تاریخی اور تحریکی پس منظر پر غور نہیں کیا۔ تحریک آزادی ہندوستان اہل ہند نے شروع کی تھی جس کے جواب میں اہل ہند کو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی مل گئی۔ پہلے نمبر پر مسلمانوں کے ہزار سالہ دور حکومت سے آزادی۔ دوسرے نمبر پر انگریزوں کی ملک گیر غلامی سے آزادی۔ اہل پاکستان نے تو آزادی کی کوئی تحریک شروع ہی نہیں کی تھی۔ آزاد اور اکھنڈ بھارت ہندو کی خواہش تھی۔ اسلامیان ہند آزادی نہیں اپنے جداگانہ اور منفرد وجود اور تشخص کے لیے کوشاں تھے جسے بالآخر انہوں نے حاصل کرلیا۔ اس حقیقت کو جان لینے کے بعد بھی اگر یوم آزادی منایا جاتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حصول پاکستان کے بعد بھی حکومت پاکستان کے ارباب بست وکشاد آج تک اپنے آپ کو من حیث الپاکستانی سمجھ ہی نہیں سکے۔ یوں یوم آزادی منا کر ہندوستان کی سیاسی اور آزادی کی تحریک کا اپنے آپ کو حصہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس طرح ہندوستان کی غلامی اور آزادی کی نظریاتی اساس سے اپنے آپ کو ہم آہنگ رکھنا چاہتے ہیں۔ آزادی ہند تاریخ برصغیر کا ایک منفرد باب ہے۔ اس آزادی کا مطلب ہندو رام راج تھا۔ اس بات کو تحریک آزادی ہندوستان کے دوران مختلف ہندو مذہبی اور عسکری جماعتوں اور تنظیموں اور تحریکوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا۔ مختلف صوبوں میں اپنے دور حکمرانی کے دوران کانگریس نے اپنی مختلف انتہا پسند ہندو جماعتوں اور تنظیموں کے خبث باطن کو عملی طور پر سچ ثابت کر دکھایا تھا۔ یوں مسلمان متحدہ آزاد ہندوستان کے مکروفریب کی چال کو سمجھ گئے اور یہ چال خود کانگرس اور ہندو جماعتوں اور تنظیموں نے مسلمانوں کو سمجھا دی' یوں مسلمان اکھنڈ بھارت کی حقیقت کو جان گئے اور اپنے لیے الگ آزاد وخودمختار جداوطن کا مطالبہ کیا' ایسا وطن جو ان کی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز ہو۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اہلیان پاکستان اب تحریک آزادی ہند کے اس سیاسی اور ثقافتی تعلق کو ختم کر دیں جسے حالات و واقعات کے خوبصورت موڑ نے خود ختم کر دیا تھا۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے کہ سب سے پہلے پاکستان کی تشکیل اور معروضی حیثیت کے مطابق الفاظ و اصطلاحات استعمال کی جائیں۔ لفظوں کا استعمال کرتے ہوئے شعبوں کا تعین کیا جائے۔ عوام کے ساتھ لفظوں کی شعبدہ بازی کا کھیل ختم کیا جائے۔ پاکستان عدم سے معروض کی جانب سفر تھا اس کی غایت کو سمجھا جائے۔ یہ ایک خواب کی تعبیر ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

19 اپریل 1938ء

بیسویں صدی کا آغاز ہے۔ مشرق کی تہذیب و تمدن کے ٹمٹانے والے آخری چراغ بھی گل ہو چکے ہیں۔ مغرب نے ایک نئے نظام تمدن کی طرح ڈالی ہے۔ جس کی درخشندگی اور تابنا کی نے بڑے بڑے دیدہ وروں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر رکھی ہے۔ دنیا بھر کی قومیں اس تہذیب جدید کی نقالی میں فخر و سعادت محسوس کر رہی ہیں۔ جلیل القدر دانایانِ روزگار اس نئے تمدن کو انسانیت کے مصائب و نوائب کے لیے مسیحا سمجھ رہے ہیں۔ بڑے سے بڑے مفکر انسانی دانش و بینش کے اس اوج کمال پر نازاں و فرحاں دکھائی دیتے ہیں۔ ہر طرف سے اس نئی روشنی کی مدح و ستائش میں قصائد لکھے جا رہے ہیں۔ چاروں سمت سے تحسین و تبریک کے غلغلے بلند ہو رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے اس نسخہ کیمیا کی برکات کے معترف ہیں۔ ایسا دکھائی دیتا ہے۔ گویا انسان نے اس فردوس گم گشتہ کو پھر سے پا لیا جس کی تلاش میں اس نے ساری عمر دشت پیمائیوں اور صحرانوردیوں میں گزار دی تھی۔ نئے انداز کی سیاست، نئی وضع کی معاشرت، معیشت کے طور طریق نرالے تعلیم کے ڈھب انوکھے۔ تمام نظام ہائے کہنہ کی بنیادیں تک اکھڑی جا چکی ہیں اور نئے نقشوں کے مطابق، بالکل جدید بنیادوں پر اس تہذیب نو کے قصر فلک بوس کی عمارت اوپر کو اٹھتی چلی جا رہی ہے جس کی رفعت و بلندی، نقش و نگار، آئینہ بندی، صریر و اطلس کے نگاہ فریب پردے، بجلی کے قمقمے اور ان قمقموں کی عالمتاب روشنی میں ایک رنگین دنیا۔ ہر دیکھنے والے کی نگاہ کو حیرت کدہ بنا رہی ہے کہ اتنے میں مشرق کے تیرہ و تار ویرانوں کا ایک تیس سالہ نوجوان اس طلسم خانۂ ہوشربا میں جا نکلتا ہے۔ وہ تہذیب نو کے اس جہان رنگ و بو میں کھویا کھویا۔ ادھر ادھر پھرتا ہے۔ ہر شے پر ایک غائرانہ نگاہ ڈالتا ہے۔ ہر چیز کو متجسانہ نظر سے پرکھتا ہے۔ کہیں رکتا ہے تو پہروں کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا خاک کے ذروں کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر اٹھتا ہے تو دیوانوں کی طرح اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔ ہونہار ایسا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین اسے مستقبل کا درخشندہ ستارہ قرار دیتے ہیں لیکن اس کے اس کمال ہوش میں کچھ ایسے غیر محسوس سے جنون کی آمیزش ہے جو اسے دوسرے ہوش مندوں سے یکسر الگ کئے ہوئے ہے۔ وہ فکر و نظر اور ہوش و جنون کے اس نرالے امتزاج سے تہذیب جدید کے اس طلسم کدہ کے ایک ایک عنصر کو دیکھتا ہے اور عین اس وقت جبکہ ساری فضا اس نظام تمدن کی توصیف و ستائش میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کے لبوں پر خفیف سے ہنسی اور اس کی آنکھوں میں ہلکے سے تبسم کی موج کے ہلکورے نظر آ رہے ہیں۔ وہ اس پورے تماشے کو اپنی نگاہوں کے دامن میں سمیٹ کر لوٹتا ہے اور لب ساحل ایک اونچی سی چٹان پر کھڑا ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھتا اور بلند آواز سے پکارتا ہے۔

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دوکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

اور یاد رکھو کہ:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

سننے والوں نے سنا اور اسے مجذوب کی بڑ سمجھ کر ایک فلک بوس

قہقہہ لگایا اور اس کے بعد پھر اسی کیف و مستی کی دنیا میں جذب ہوگئے۔ یہاں پہنچنے پر پوچھنے والوں نے پوچھا کہ کہو بھائی! حیرت خانۂ مغرب کی سیر تو کی۔ وہاں تہذیب نو کے ''پری محل'' کو بھی دیکھا! کیا خیال ہے؟ اس نے اپنے مخصوص انداز میں نگاہوں کو اٹھایا اور کہا کہ.....ہاں دیکھا! چمک دمک تو بڑی ہے لیکن

پیر میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوان فرنگ
ست بنیاد بھی ہے، آئینہ دیوار بھی ہے

زمانہ آگے بڑھتا گیا شیشہ گران فرنگ اپنے کاخ تہذیب کی آئینہ بندی میں پہلے سے بھی زیادہ تیزی اور انہماک سے مصروف رہے۔ دنیا اسے بدستور خدا کی رحمت تصور کرتی رہی۔ انسانیت اسی طرح اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی۔ تا نکہ 1904ء میں ایک عالمگیر دھماکہ ہوا۔ دھماکہ زلزلہ کی صورت اختیار کر گیا اور چار برس تک متواتر بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہوتی رہیں۔ میدانوں کا ذرہ ذرہ انسانی خون کی ارزانی کی زندہ داستان بن گیا لیکن مغرب نے اس کے بعد پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اس قصرِ جدید کی تزئین و آرائش اور حفاظت و صیانت میں پہلے سے بھی زیادہ جوش اور سرگرمی سے منہمک ہوگیا۔ سطح بیں نگاہوں نے اس ''ہوشمند دیوانہ'' سے پھر پوچھا کہ اب کیا کہتے ہیں آپ؟ آپ کی وہ پہلی پیشن گوئی تو غلط ثابت ہوئی۔ اس مرد دانا کی آنکھوں میں پھر تبسم کی لہر دوڑی اور اب کے پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہو کر دوڑی۔ اپنے مخصوص انداز میں سر اٹھایا اور کہا کہ میری آنکھوں نے غلطی نہیں کی۔ میں نے جو کچھ کہا تھا، حرف حرف دیکھ کر کہا تھا۔ وہ غلط نہیں ہوسکتا۔ مغرب کو یہ فطرت کی طرف سے پہلی تنذیر ملی تھی وہ اس سے عبرت حاصل کرتے تو بچ جاتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور میری آنکھیں پھر دیکھ رہی ہیں کہ

فتنہ ٔ را کہ دو صد فتنہ در آغوشش بود
دخترے ہست کہ در مہد فرنگ است ہنوز

سننے والوں نے اسے سنا اور سن کر ان سنی کر دی۔ مغرب کے قمقموں کی روشنی اپنی خیرگی میں اور بھی بڑھتی گئی۔ اب ساری دنیا اس کی نقال تھی اور اس نقالی میں فخر محسوس کرتی تھی۔ پوچھنے والوں نے پھر اس ''مجذوب زیرک'' سے پوچھا کہ فرمایئے! آپ کیا کہتے ہیں۔ اب تو اس قصر بلند کی رفعت کہکشاں تک جا پہنچی ہے۔ اس نے پھر ایک سیلاب تبسم سے پوچھنے والوں کی طرف دیکھا اور کہا کہ

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی
الٹ جائیں گی تدبیریں، بدل جائیں گی تقدیریں
حقیقت ہے، نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی

دنیا نے اس پر ایک قہقہہ لگایا اور مغرب اپنی شیشہ گری اور مشرق اس کی نقالی میں پھر مصروف ہوگیا اور وہ مرد زیرک پھر اپنی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ مغرب نے زمین پر جال بچھا لیا۔ مغرب نے آسمان پر قابو پا لیا۔ اس نے پانی پر اپنا تسلط جما لیا۔ اس نے خشکی اور تری کو مسخر کر لیا۔ اس نے اپنی حفاظت کے پورے سامان مہیا کر لیے۔ ادھر یہ ہوتا گیا اور ادھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس دانائے راز پر کچھ عجیب سراسیمگی کا عالم طاری ہو رہا ہے۔ وہ بیٹھا بیٹھا اس طرح چونک اٹھتا جیسے ایک حسین و معصوم بچہ خواب میں دہشت ناک عفریت خونخوار کو دیکھ کر چیخ اٹھتا ہے۔ وہ تصور ہی تصور میں کچھ دیکھتا اور یوں ڈر کر سہم جاتا۔ جیسے آگ اور خون کا کوئی سیلاب بلا بڑھتا چلا آ رہا ہو۔ وہ پہاڑی کی چوٹی پر دور افق سے اس پار کچھ دیکھتا اور بیساختہ چلا اٹھتا کہ

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے!
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ!
وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو!
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ!

وہ دیکھو

جہان نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالم پیر مر رہا ہے!
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ!

وہ راتوں کی تنہائیوں میں اکیلا دیوانہ وار پھرتا۔ کبھی آسمان کے

خاموش ستاروں سے باتیں کرتا کبھی ندی کی ساکت روانیوں سے محو تکلم ہوتا۔ وہ جنگل کے ویرانوں سے۔ دور شہر کی اس محفل شعر و شراب کی چکاچوند کو دیکھتا جسے بڑے بڑے ہوشمندوں نے باعث گرمی کائنات سمجھ رکھا تھا تو ایک ٹھنڈی سانس بھرتا اور اپنے سینے کے داغوں کو نمایاں کر کے پکار اٹھتا کہ

وہ بزم عیش ہے مہمان یک نفس دو نفس
چمک رہے ہیں مثال ستارہ جس کے ایاغ
اور..... دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آ گئی شاید جہانِ پیر کی موت

وہ کبھی کسی نخلستان کے قریب، کھجوروں کے جھنڈ کے سایہ میں وجد و مستی میں رقص کرتا اور مطرب فطرت کی نے نوازی کی ہم آہنگی میں والہانہ انداز میں گاتا نظر آتا کہ

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے !
گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا !

ایک حجازی قافلہ پاس سے گزر رہا تھا۔ سالار کارواں نے اس تماشہ کو حیرت سے دیکھا اور کہا کہ بابا! یہ کیا کہتے ہو۔ آؤ! تمہیں دکھائیں کہ اس تہذیب نو نے ہمارے عروق مردہ میں کس طرح ایک نیا خون زندگی دوڑا دیا ہے۔ اس نے اس سادہ لوح میر کارواں کی بات سنی اور ہنس کر کہا کہ ارے نادان!

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لب گور

اس نے پوچھا کہ پھر ہوگا کیا؟ فرمایا کہ

آنچہ بوداست و نبایدزمیاں خواہد رفت
آنچہ بائیست و نبوداست ہماں خواہد بود

اس نے پوچھا کہ اس کیلئے پھر کرنا کیا چاہئے جواب ملا کہ :

اگر دردل جہان تازۂ داری بروں آور
کہ افرنگ از جراحت ہائے پنہاں بسمل افتاد است

اس نے سمجھا کہ شاید دنیائے مسیحیت پھر کسی صلیبی جنگ کے ارادے کر رہی ہے لیکن اس مرد دانا نے کہا کہ نہیں

من از ہلال و چلیپا دگر نیندیشم
کہ فتنۂ دگرے درضمیر ایام است

اس نے کہا کہ مغرب کے آہنی پنجے تو زمین و آسمان کو اپنی قاہری گرفت میں لیے بیٹھے ہیں۔ اس چنگل سے رستگاری بھلا کیسے ممکن ہے! مرد قلندر ہنسا اور اس نے کہا کہ اس گرفت کی شدت بجا اور درست لیکن

پانی بھی مسخر ہے ہوا بھی ہے مسخر
کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے
دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے

لیکن یہ باتیں اس پوچھنے والے کی سمجھ سے باہر تھیں۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مغرب جو اس قدر بے پناہ قوتوں کا مالک ہے کبھی تباہ و برباد ہو سکتا ہے۔ وہ شوکت و سطوت، غلبہ و تسلط، استیلا و قہرمانی کے اس بحر مواج کو دیکھتا اور کانپ اٹھتا۔ وہ بھلا کیسے باور کر لیتا کہ کہنے والا سچ کہتا ہے لیکن کہنے والا کچھ ایسے جزم و یقین سے کہہ رہا تھا۔ گویا اس کے سامنے سینما کا ایک فلم چل رہا ہے جسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر وہ بتاتا جاتا ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اس نے اس پوچھنے والے سے کہا کہ تیری حیرت اور استعجاب درست! لیکن جو میں کہتا ہوں وہ بھی غلط نہیں۔

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائیِ تدبیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

سننے والے نے سننے کو تو سنا کہ ان باتوں میں لذت و جاذبیت بہت تھی لیکن اسے محض ''شاعری'' ہی سمجھا اور دادِ سخن دے کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے جاتے جاتے بھی اس مردِ قلندر نے اسے آواز دی اور کہا کہ میری باتوں کو شاعری نہ سمجھ۔ یہ حقیقت ہے۔

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی درپئے تعمیر جہان دگر است

لیکن سننے والے نے اسے بھی شاعری ہی سمجھا اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اس مردِ دانا نے ایک ٹھنڈی آہ کھینچی اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

مغرب ز توبیگانہ مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ درعالم نقش دگرانگیزی

دنیا اپنی روش پر بدستور چلی جا رہی تھی۔ تہذیبِ مغرب اپنے پورے شباب پر تھی۔ نظامِ افرنگ کی رعنائیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا لیکن یہ فقیرِ کجکلاہ برابر اپنی پکار کو دہرائے جا رہا تھا کہ

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دیدہ ور کو کیا نظر آ رہا ہے جس کی بنا پر یہ اس شدت و اصرار سے اپنی بات کو دہرائے جا رہا ہے لیکن کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے یہ مغنیِ آتش نفس خلوت و جلوت، بستی اور ویرانہ میں ہر جگہ اپنے پیغام کو پہنچائے جا رہا تھا۔

بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم
غزل سرایم و پیغام آشنا گویم
بخلوتے کہ سخن می شود حجاب آنجا
حدیث دل بزبان نگاہ می گویم

جب پوچھنے والے زیادہ اصرار کرتے تو وہ ایک ہلکے سے معنی خیز تبسم سے اتنا کہہ دیتا کہ

آنکھ جو دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں !
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی !

اس سے ان کی حیرت اور بھی بڑھ جاتی اور وہ زیادہ کاوش سے بات کریدنے کی کوشش کرتے تو یہ خم کدہ حجاز کا متوالا یارانِ میکدہ سے کہہ دیتا کہ

بگرداں جام واز ہنگامۂ افرنگ کم تر گو
ہزاراں کارواں بگزشت ازیں ویرانہ پے درپے

متجسس قلوب سے تو وہ اس شانِ دلربائی سے باتیں کرتا لیکن اگر کوئی ضد اور کد سے ان حقائق کو جھٹلانے کی کوشش کرتا تو اس سے ذرا کھلے کھلے الفاظ میں گفتگو کرتا اور برملا کہہ دیتا کہ

گفت اے گندم نمائے جوفروش
از تو شیخ و برہمن اندر خروش
حکمتے کو عقدۂ اشیاء کشاد
باتو غیراز فکر چنگیزی نداد
مرگ تو اہل جہاں راز زندگیست
باش ! نابینی کہ انجام تو چیست

وہ کچھ اس قسم کی باتیں کرتا لیکن اس کی باتوں میں کچھ ایسی حلاوت تھی کہ ہر ایک کا جی چاہتا کہ اس سے ذرا اور قریب ہو کر اس کی باتیں سنی جائیں۔ لوگ قریب تر ہوتے تو وہ ذرا اور دور ہو جاتا' اپنا محرمِ راز کسی کو نہ پاتا۔ وہ اپنی باتیں اپنے دل سے زیادہ اطمینان سے کرتا لیکن غیر سے کرتا یا اپنے آپ سے۔ آنے والے انقلاب کے تصور سے اس کا دل طلسمِ پیچ و تاب بنا رہتا۔ وہ رات کی تنہائیوں میں اٹھ اٹھ کر روتا اور دعائیں مانگتا کہ

یابکش درسینۂ من آرزوئے انقلاب
یادگرگوں کن نہاد ایں زمان و ایں زمیں
یاچناں کن یاچنیں!

وہ زمانہ کی بے کیف گردش دولابی سے گھبرا اٹھتا اور خالق

فطرت سے اپنے عجیب محبوبانہ انداز میں کہتا کہ

طرح نوافگن کہ ماجدت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانہ امروز و فرداساختی

زمانہ آگے بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس نئے نواز کی نوا میں تلخی اور لے میں سوز بھی زیادہ ہوتا گیا۔ وہ اب حقائق کو زیادہ نکھرے ہوئے الفاظ میں بیان کرنے لگ گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جو چیزیں پہلے اس کے عالم تصور میں دھندلے سے خواب کی صورت میں متشکل تھیں۔ اب محسوس پیکر اختیار کر رہی ہیں۔ اب وہ کھلے کھلے الفاظ میں کہتا کہ

یہ عناصر کا پرانا کھیل یہ دنیائے دوں
ساکنانِ عرش اعظم کی تمناؤں کا خوں
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف ونوں
(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' ارمغانِ حجاز آخری تصنیف)

ابلیس کے ایک دوسرے مشیر کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔

زاغِ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہینِ چرخ
کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر
جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا! وہ جہاں زیروزبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

غرضیکہ وہ صاحب خرد و جنون اس تہذیب کے مآل سے دنیا بھر کو آگاہ کئے جاتا رہا لیکن دنیا کی وہی حالت رہی کہ اس کی باتوں کو سنا اور پھر اپنے دھندوں میں مصروف ہو گئے۔ زمانہ یوں ہی گزرتا گیا کہ ایک دن بستی والوں نے دیکھا کہ یہ مرد درویش کچھ اس انداز سے مضطرب و بیتاب ہے جس طرح بعض پرندے طوفان آنے سے پیشتر اضطراب و سراسیمگی میں ادھر ادھر اڑتے اور چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ بابا! خیر ہے؟ آج یہ بیکلی اور بے چینی کیوں ہے؟ کہا کہ تمہیں کیا بتاؤں! اگر عافیت چاہتے ہو تو اب بھی اپنے آپ اور اپنی نسلوں کو خدائے قوی و مقتدر کی حفاظت میں لے آؤ ورنہ یاد رکھو کہ طوفان بلاانگیز میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاؤ گے:

خبر ملی ہے خدایانِ بحرو بر سے مجھے
فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

بستی والوں نے سنا اور حسب دستور ایک خفیف سی ہنسی سے اس کا استقبال کیا۔ رات کو معمولاً محفل رقص و سرود میں محو کیف و سرور رہے۔ آخری شب آنکھ لگی تو محسوس ہوا کہ گویا زلزلہ کے جھٹکے آ رہے ہیں۔ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ دیوانگی میں ادھر ادھر بھاگے۔ دیکھا تو اس قصر مشید کی بنیادیں تک ہل رہی ہیں جس کے متعلق کبھی تصور میں بھی نہ آتا تھا کہ یہ متزلزل ہو سکے گا۔ آندھی اور جھکڑ کا طوفان' زلزلے کے جھٹکے' یہ مکان گرا' وہ دیوار ٹوٹی' باہر تند و تیز بارش' اندر تباہی و بربادی' سامنے ڈنزنگ کی پہاڑیوں کو دیکھا تو آتش فشاں چوٹیوں سے لاوے کا سیلاب امنڈا چلا آ رہا ہے اور جو کچھ سامنے آتا ہے اسے اپنے مہیب شعلوں کی لپیٹ میں لئے بربادیوں کے جہنم میں دھکیلتا چلا جاتا ہے۔ بستی والوں کو اپنے پرائے کا کچھ ہوش نہ تھا۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ مرد انا کیا کہتا تھا! اس سراسیمگی میں اٹھے اور اس فقیر کی کٹیا پر پہنچے لیکن دیکھا تو کٹیا خالی ہے۔ وہ مرد درویش کہیں چلا گیا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ اب کوئی تدبیر سجھائی نہیں دیتی تھی۔ کٹیا کے اندر عین وسط میں نور قرآنی کی قندیل جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ ایک طرف ایک کدوئے کہنہ میں عشق محمدیؐ کی شراب کوثریں چھلک رہی تھی اور سامنے دیوار پر جبریل کے پروں سے لکھا تھا کہ

سرودے رفتہ بازآید نیاید
نسیمے از حجاز آید نیاید!
سرآمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید نیاید

بستی والوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو ایک طرف ایک کشکول دکھائی دی جس کے اوپر جلی حروف میں لکھا تھا۔

''بحضور ملت''

دیکھا تو اس میں کاغذات کے کچھ ٹکڑے نہایت ترتیب سے رکھے ہیں۔ سب سے اوپر 1907ء کا ایک ٹکڑہ ہے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ ملت بیضا کا انحطاط اپنی انتہائی پستی تک پہنچ چکا تھا اور کہیں کسی طرف۔ امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔ عین اس مایوسی اور بیکسی کے ماحول میں اس امیدوں کے شاہزادے نے گرتی ہوئی قوم کا بازو تھاما اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ کیوں گھبراتے ہو؟ کیوں خوف کھاتے ہو۔

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ میں نے قدسیوں سے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہوکشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

لوگوں نے سنا اور ایک معنی خیز تبسم سے اس کا استقبال کیا کہ یہ انحطاط اور اس پر یہ ''موہوم'' امیدیں!

اس کے نیچے 1912ء کا ایک پرزہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب جنگ بلقان میں ملت اسلامیہ کے ترکش کا آخری تیر بھی نشانہ خطا کر کے ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ سطوت اسلامیہ کے ابھرنے کی بظاہر کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ مایوسیوں کی تاریکی نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ اس ظلمت و تاریکی میں وہ شمع بَردار کاروان حجاز اٹھا اور اپنی مخصوص لے میں پکار کر کہا کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں آ اور جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ..... دیکھ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کہ کس طرح

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نگہت خوابیدہ غنچے کی نواہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک
بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اس کے ساتھ ہی ایک اور ٹکڑے پر یہ لکھ رکھا تھا:

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی !
کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی
گل برانداز ہے خون شہداء کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

(جواب شکوہ)

ادھر یورپ کے میدانوں میں خون مسلم کی یوں ارزانی ہو رہی تھی اور ادھر ہندوستان میں انہی دنوں ایک ایسی تحریک کی ابتدا تھی جو آتش خاموش کی طرح وحدت ملت اور عالمگیریت اسلام کو اندر ہی اندر جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دینے والی تھی۔ اس مردِ دانا کی نگہ دوررس اگر ایک طرف لالہ زار مغرب کے آتشیں منظر پر محو خونابہ فشانی تھی تو دوسری طرف اس تحریک جدید کی ہلاکت سامانیوں سے بھی غافل نہ تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب کسی کے حیطہ تصور میں بھی نہ تھا کہ قومیت پرستی (یعنی وطن کو وجہ جامعیت قرار دے کر متحدہ قومیت کی تشکیل) میں بھی مسلمانوں کیلئے کسی قسم کا کوئی خطرہ ہے۔ بڑے بڑے دردمندان ملت اپنی وطن پرستی پر فخر کرتے نظر آتے تھے لیکن ان سب میں اکیلا مرد دانا تھا جس نے بلند آہنگی سے پکار کر کہا کہ

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ تہذیب مغرب کی تقلید میں نیشنلزم گویا وقت کا فیشن بن رہی تھی۔ مہذب ہونے کا ثبوت یہ تھا کہ انسان نیشنلسٹ ہو۔ عین اس زمانہ میں اس دیدہ در کی نگاہوں نے دیکھ لیا کہ یہ نیا فتنہ کس قدر اسلام کے بنیادی خطوط سے متضاد و متبائن ہے۔ اس نے قوم کو جھنجھوڑ کر کہا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی !

اس لیے کہ:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

(1908ء)

اس کے بعد ایک اور ورق ملا۔ یہ اس زمانہ کا لکھا ہوا تھا کہ جب ہندوستان میں جدید اصلاحات کا دور دورہ تھا جن کی مدد سے یہاں مغربی انداز کے جمہوری نظام کی طرح ڈالی گئی تھی۔ وقت وہ تھا کہ مغربی جمہوریت کو نوع انسان کی تمام مصیبتوں کا حل بتایا جاتا تھا۔ اس میں اصل آزادی کا راز مضمر سمجھا جاتا تھا۔ تمام ہندوستان نے جمہوری نظام کی طرف ان اصلاحی اقدام کا خیر مقدم کیا حتی کہ مسلمانوں کی طرف سے تو بلند آہنگی سے نعرے لگنے شروع ہو گئے کہ اسلام جمہوریت کا مذہب ہے اور کسی نے یہ نہ سمجھا کہ اس جمہوریت اور اسلامی جمہوریت میں کس قدر بعد المشرقین ہے۔ یہ جمہوریت وہ تھی جس کی رو سے قانون سازی کا اختیار انسانوں کی ایک جماعت کے سپرد کیا جاتا تھا اور یوں اقلیت پر اکثریت کے فیصلوں کی پابندی لازم تھی۔ (ادھر ساری دنیا اور ہندوستان کے مسلمان) ان جمہوری اصلاحات پر چراغاں کر رہے تھے اور ادھر یہ مرد دانا انہیں متنبہ کر رہا تھا کہ یاد رکھو!

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اس ورق کے دوسری طرف لکھا تھا۔

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

انہی دنوں کا لکھا ہوا ایک اور ورق ملا۔ زمانہ وہ تھا جب یورپ کے گدھ (ترکی کے) مرد بیمار کی لاش پر منڈلا رہے تھے۔ عرب و عجم میں مسلمانوں کی رہی سہی قوتیں بھی ختم ہو رہی تھیں۔ جنگ عظیم کے بعد کے اثرات سے ملت اسلامیہ کا جسم ناتواں نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ زمانہ جس میں:

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل
خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز !
ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

اس عالمگیر مایوسی میں جبکہ کہیں سے شعاع امید جلوہ افروز نظر نہیں آتی تھی۔ اس مرد مومن نے اپنی قرآنی فراست سے دیکھا کہ مایوسیوں کے ان خوفناک بادلوں کے پیچھے امید کی سنہری کرن بھی موجود ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈوبتی ہوئی قوم کو حوصلہ دلایا کہ وجہ اضطراب کچھ نہیں:

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دور گراں خوابی !

عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ تر کمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

اس کے نیچے لکھا تھا:

سرشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

ادھر اس قدر تابناک امیدوں کی قندیل کو روشن کیا لیکن اس کے ساتھ ہی یورپ کی ہمسائیگی میں بسنے والے ترکوں کو اس سے بھی آگاہ کر دیا کہ یاد رکھو کہیں تم بھی تہذیب مغرب کے فریب میں نہ آ جانا:

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو
ہوس کے پنجہ خونیں میں تیغ کار زاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

پھر ایک اور یادداشت ملی۔ یہ اس زمانہ میں لکھی گئی تھی جب روس کا بالشیویکی نظام عالمگیر حیثیت اختیار کئے جا رہا تھا اور چونکہ یہ نظام، سرمایہ داری کا ردعمل تھا اور گھبرایا ہوا انسان یہ سمجھ رہا تھا کہ بس وہ تریاق ہاتھ آ گیا جو زمانہ حاضر کے ہر قسم کے زہر کا مداوا ہے۔ اپنے مرکز سے ہٹا ہوا مسلمان بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ ہاں! یہ نظام عین اسلامی نظام ہے۔ اس عالگیر غلغلہ اندازی میں اس مرد دانا نے اس نظام اشتراکیت کا تجزیہ کیا اور فریب خوردہ مسلمان کو بتایا کہ یہ بھی سراب ہی سراب ہے۔ قومیں صرف تخریب (لا) سے بلند نہیں ہوا کرتیں۔ اس کے ساتھ تعمیر (الا) کی بھی ضرورت لاینفک ہوتی ہے۔ نظام اشتراکیت پر غور کرو۔

فکر او در تند بادلا بماند
مرکب خودراسوئے الانراند
آیدش روزے کہ اززورجنوں
خویش رازیں تند باد آرد بروں
درمقام لانیا سابد حیات
سوئے الا می خرامد کائنات
لاو الا سازوبرگ امتاں
نفی بے اثبات مرگ امتاں

پھر ایک اور یادداشت ملی۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب یورپ نے بین الاقوامی معاملات کے تصفیہ کیلئے مجلس اقوام کی طرح ڈالی تھی اور دنیا خوش تھی کہ اب نزاع اور جھگڑوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ جنگ نابود ہو گئی۔ اب کمزوروں پر ظلم و استبداد روا نہیں رکھا جائے گا۔ ہر ایک کی دادرسی ہو گی۔ دنیا خوش اور مطمئن تھی لیکن اس مرد دانا نے سر ہلا دیا اور کہہ دیا کہ:

برفتد تاروش رزم دریں بزم کہن !
دردمندان جہاں طرح نوانداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرتقسیم قبور انجمنے ساختہ اند !

اس کے نیچے لکھا تھا:

نقش نو اندر جہاں باید نہاد
ازکفن دزداں چہ امید کشاد
درجنیوا چیست غیراز مکروفن
صید تو ایں میش و آں نخچیرمن
نکتہ ہا کومی نگنجد درسخن
یک جہاں آشوب و یک گیتی فتن

ادھر یہ ہو رہا تھا اور ادھر ہندوستان میں وطن پرستی، متحدہ قومیت کا دام ہمرنگ زمیں وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا تھا اور بھولا بھالا

مسلمان بلا سوچے سمجھے اپنے ہاتھوں سے اس دام کے حلقے کستا چلا جا رہا تھا لیکن یہ دانائے راز برابر پکارتا چلا جا رہا تھا کہ یاد رکھو یہ سراب رنگ و بو ہے۔ یہ تمہاری غلامی کی نئی زنجیریں ہیں۔ وطنیت کی بنا پر قومیت کا تصور تمہیں دور اسلام سے نکال کر کہ عہد جاہلیت کی طرف لے جائے گا۔ ایک کاغذ کے پرزے پر اس بحری تار کی نقل تھی جو گول میز کانفرنس میں شریک ہونے والے مسلمان نمائندوں کے نام بھیجی گئی تھی کہ دیکھنا کہیں مخلوط انتخاب کو تسلیم نہ کر لینا۔ یہ تمہاری جمعیت اسلامی کی بنیادیں اکھیڑ کر رکھ دے گا۔ ایک یادداشت کا تھوڑا سا ٹکڑا موجود تھا جس میں نہرو رپورٹ کی مخالفت کی تلقین تھی۔ 1930ء کی لکھی ہوئی ایک لمبی چوڑی دستاویز ایک خریطہ کے اندر سنبھال کر رکھی ہوئی ملی۔ اس میں بڑے کام کی باتیں تھیں۔ ایک مقام پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

''میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب' صوبہ سرحد' سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیر سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔''

بستی کے لوگ کشکول کی ان دستاویزوں کو کھول رہے تھے اور فقیر کی ہیبت ان کے دلوں پر چھائے جا رہی تھی' وہ محسوس کرتے تھے کہ گویا وہ ابھی تک کٹیا کے اندر ہی ہے۔ ان دستاویزوں کا انداز کچھ ایسا لا ہوتی سا تھا کہ وہ اس زمین کی باتیں نظر ہی نہیں آتی تھیں۔

پھر کچھ اور متفرق یادداشتیں ملیں کسی میں افسردہ دل صوفی سے کہا گیا تھا کہ:

یہ حکمت ملکوتی یہ علم لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

فقیہہ شہر میں رہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

کہیں اس زمانہ کے جھوٹے مدعیان امامت و نبوت سے خطاب تھا کہ:

فتنہ ملت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

کہیں افرنگ زدہ مسلماں سے کہا گیا تھا کہ

ترا وجود سراپا تجلی افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکر خاکی خودی سے خالی ہے
فقط نیام ہے تو زرنگاہ بے شمشیر

کہیں ارباب فنون لطیفہ کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ:

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا !
شاعر کی نواہو کہ مغنی کا نفس ہو !
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادسحر کیا؟

کہیں فلسفہ دانوں کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ:

سن مجھ سے نکتہ دل افروز
انجام خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفہ زندگی سے دوری

بستی والے ان یادداشتوں کو دیکھتے تھے اور حیران ہوئے جاتے تھے کہ یہ مرد قلندر کسی مقام بلند پر تھا کہ اس کے سامنے ہر شے اپنی اصلی شکل میں بے نقاب ہو جاتی تھی اور وہ ان تمام چیزوں کے محاسن و معائب کو کس طرح کھلے ہوئے الفاظ میں بیان کر دیتا تھا۔ پھر یہ بھی کہ اس چھوٹی سی کٹیا کے اندر رہتے ہوئے اس کی نگاہ کس طرح:

یک چمن گل، یک نیستاں نالہ یک خمخانہ مے

اپنے دامن میں رکھتی تھی کہ زندگی کا کوئی شعبہ اور علم وسائنس کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا کہ جس کو یہ محیط نہ ہو

ایک پرزہ دیکھا تو اس پر گویا آتشیں حروف میں چند شعر لکھے ہوئے ملے:

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرور برسرمنبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبرز مقام محمد عربی است
بمصطفی برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر باد نرسیدی تمام ابولہبی است

پڑھنے والوں میں سے ایک نے کہا کہ جن صاحب کا نام لیا گیا ہے یہ تو سنا ہے کہ کسی دینی مکتب کے صدر مدرس تھے۔ ایک گوشے میں ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو واقعی صدر مدرس تھے لیکن اس فقیر دانا کو تم کیا سمجھتے ہو! اس کی شکل وصورت اور وضع قطع پر نہ جاؤ۔ اس کے لگے کا عالم ہم نے تو اپنی زندگی میں دیکھا نہیں۔ بستی والے یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے اور بیٹھے سر پیٹ رہے تھے کہ ہم نے اس دانائے راز کی کچھ قدر نہ کی یہ تو بیٹھے ہی بیٹھے دنیا کو کچھ سے کچھ کر گیا ہے۔ بستی والوں نے اس مرد بزرگ سے پوچھا کہ سائیں بابا! یہ تو بتاؤ کہ یہ مرد دانا اس قسم کی باتیں کہتا کس طرح سے تھا۔ یہ تو ہمیں کسی اور ہی دنیا کا انسان نظر آتا ہے۔ اس نے کہا کہ لوگوں کی یہی تو بھول ہے۔ یہ مرد دانا اسی دنیا کا انسان تھا۔ اس نے نہ (معاذ اللہ) نبی ہونے کا دعویٰ کیا نہ مہدی کا نہ وہ مجددیت کا مدعی ہوا نہ امامت کا۔ اس نے اپنے آپ کو سیدھا سادا مسلمان کہا اور بس۔ بستی والوں نے پوچھا کہ ہماری بات تو وہیں کی وہیں رہی کہ جب اس نے کوئی دعویٰ بھی نہیں کیا تو پھر وہ ایسی باتیں کس طرح کہتا تھا۔ مرد بزرگ نے کہا کہ میں نے خود اس سے یہ سوال کیا تھا جس کے جواب میں مرد دانا نے اپنے مخصوص تبسم سے کہا کہ اس میں ''کرامات'' کی کوئی بات نہیں۔ اپنی آنکھیں جن پر کسی بیرونی اثر کا رنگین چشمہ نہ ہو اور قرآنِ کریم کی روشنی اس سے وہ فراست پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہر شے کی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے:

میانِ آب و گِل خلوت گزیدم
ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزہ چشم
جہاں راجز بچشمِ خود ندیدم

میری صہبائے بصیرت (مردِ دانا نے کہا) خمکدہ حجاز سے سربمہر آبگینوں میں آتی ہے جس میں خالص قرآن ہوتا ہے۔ یہ کہا اور مردِ دانا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے فرمایا کہ کیا آپ نے میری وہ دعا نہیں سنی جو آہِ سحرگاہی اور نالہ نیم شبی کے تحائف کے ساتھ میں نے بحضور خواجہ کونین پیش کی ہے۔ سنئے کہ میں نے کیا درخواست پیش کی ہے۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است
در بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردہ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں راز خادم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسہ پاکن مرا

آخری مصرعہ پڑھا اور پڑھتے ہی وہ مردِ دانا بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رونے لگ گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سر سے پا تک قلب ہی قلب ہے جو سوز وگداز وتپش وخلش کا نازک آبگینہ ہے۔

بستی والے اس مرد بزرگ کی باتیں سن رہے تھے۔ ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو اور دل میں طلسمِ اضطراب موجزن تھا۔ انہوں نے دیکھا تو ایک پرزے پر لکھا تھا۔

پس از من شعرِ من خوانند و مے یا بندومی گویند
جہانے را دگرگوں کر دیک مردِ خود آگاہے!

بستی والوں نے اس شعر کو دیکھا اور بلک بلک کر رونے لگ

گئے جب ذرا سنبھلے تو کہا کہ اے کاش! ہمیں یہ بھی بتا دیا ہوتا کہ بالآخر اب ہم کریں کیا؟ دیکھا تو ایک ورق پر لکھا تھا۔

اے اسیر رنگ پاک از رنگ شو
مومنِ خود کافرِ افرنگ شو
رشتہ سود و زیاں در دستِ تُست
آبروئے خاوراں در دستِ تست
ایں کہن اقوام را شیرازہ بند
رایتِ صدق و صفارا کن بلند
اہلِ حق را زندگی از قوت است
قوتِ ہر ملت از جمعیت است

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں
قوت بے رائے جہل است و جنوں

بستی والے افسردہ و غمگین کٹیا سے باہر آ گئے ہر ایک کی آنکھیں متلاشی اور قلب متمنی تھا کہ اے کاش! وہ مردِ دانا کہیں سے پھرتا پھراتا ایک مرتبہ پھر ادھر آ نکلے۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبے ہوئے آہستہ آہستہ جا رہے تھے کہ انہوں نے سنا کہ دور پہاڑی کے دامن میں میٹھے میٹھے سروں میں کوئی گائے جا رہا ہے کہ:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک مفید مراسلت

مسلمان کی تعریف DEFINITION

جب بھی کوئی قوم خود فریبی میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس کی معاشرتی زندگی میں منافقت در آتی ہے اس ملک پاکستان کو وجود میں لاتے وقت ہماری فکری اور نظریاتی ترجیحات اور تھیں لیکن پاکستان بن جانے کے فوراً بعد اچانک ہماری فکری و نظریاتی ترجیہات یکسر تبدیل ہو گئیں یا پھر معاشرتی اور معاشی سازش کے تحت تبدیل کر دی گئیں۔ اس وقت ہمارے نہاں خانہ شعور کے کسی بھی گوشہ میں ہماری اولین ترجیحات موجود نہیں ہیں۔ پچاس سال قوموں کی زندگی میں بے حد اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر ہم اپنے گردوپیش کے ان ممالک کا جائزہ لیں جنہوں نے ہمارے ساتھ ہی آغاز سفر کیا تھا تو اس وقت وہ ممالک دنیا کی قیادت کے اعلیٰ مقام پر فائز نظر آتے ہیں اور ہم ان کے آگے کاسۂ گدائی لئے کھڑے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ان ممالک نے اپنے آغاز سفر میں اپنی فکری اور نظریاتی منزل کے لئے اپنی ترجیحات و اہداف کا تعین کر لیا تھا۔ اس پر وہ آج تک اپنے پورے تیقن کے ساتھ عمل پیرا ہو کر ان کے ثمرات سے مستفید ہوتے چلے آ رہے ہیں۔

اس کے برعکس پاکستان کو وجود میں آئے پچاس سال بیت چکے ہیں لیکن ہنوز ہماری اولین فکری اور نظریاتی منزل (اسلامی ضابطہ حیات کا نفاذ) کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا۔ اس کی بنیادی وجہ ہمارا فکری اور نظریاتی ابہام و انتشار ہے (ملاحظہ فرمائیں آئین پاکستان کا آرٹیکل 227 کا وضاحتی نوٹ) جس میں ہم اپنی فکری و نظریاتی شکست کا اعتراف کرتے نظر آ رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ آئین پاکستان میں یہ ترمیم شامل کرنے والے لوگ اپنے آپ کو ہندوستان کے شہری تصور کر رہے تھے۔ ورنہ پاکستان کے وجود کا ہرگز ہرگز یہ تقاضا نہ تھا۔ اب انہی وجوہات کی بنیاد پر ہم اپنی فکری و نظریاتی منزل سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ لہٰذا آئین پاکستان کے اس آرٹیکل 227 کے وضاحتی نوٹ کو فوری طور پر منسوخ کرنا ہوگا۔ کیونکہ فکر اور نظریہ ہی فرد کے کردار کا تعین کرتا ہے۔ اسی سے فکر و عمل میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اسی فکر و عمل کی ہم آہنگی سے قومیں اعلون کے مقام پر فائز ہوتی ہیں۔ اگر فکر و عمل میں ہم آہنگی نہ ہو تو دنیا کی کوئی بھی طاقت قوم میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتی۔

آج اگر حکومت خلوص نیت کے ساتھ اسلامی ضابطۂ حیات کے نفاذ کے لئے قانون سازی کا آغاز کرتی ہے تو اس کے سامنے سب سے پہلے یہ سوال آئے گا کہ مسلمان کی تعریف (Definition) کیا ہے؟ مسلمان کسے کہا جائے گا۔ اب اگر حکومت اپنے طور پر مسلمان کی تعریف (Definition) آئین میں شامل کرتی ہے تو تمام مذہبی جماعتیں فوری طور پر اسے رد کر دیں گی اور اگر کسی ایک مذہبی جماعت سے پوچھا جائے کہ مسلمان کی تعریف (Definition) کیا ہے؟ تو اس کی بتائی ہوئی تعریف و تشریح دوسری تمام مذہبی جماعتیں یا گروہ مسترد کر دیں گے۔ علیٰ ہذا القیاس تمام مذہبی جماعتیں دوسرے فرقہ یا گروہ کی بتائی ہوئی تعریف پر اتفاق نہیں کریں

گے۔

اس کا مظاہرہ 1953ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے مقرر کی گئی جسٹس منیر کمیٹی کی رپورٹ میں سامنے آ چکا ہے اس کے بعد جنرل ضیاء الحق کے دور میں نفاذ زکوٰۃ پر ملک میں زبردست ہنگامہ آرائی ہو چکی ہے۔ اس وقت بھی پاراچنار اور مالاکنڈ کے علاوہ طالبان کے نفاذ شریعت کے تصور کی مثالیں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام حکومتیں سنجیدگی کے ساتھ نفاذ اسلام کے ان بھڑوں کے چھتے کو ہاتھ لگانے سے گریزاں چلی آ رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر حکومت کو مجبوراً نفاذ اسلام کا نام تو لینا پڑتا ہے لیکن عملاً وہ کچھ کر گزرنے سے معذور ہوتی ہے۔ کیونکہ انہیں حکومت بھی کرنی ہوتی ہے۔ اس لئے موجودہ صورت حال میں مسلمان کی تعریف (Definition) کئے بغیر یہاں اسلامی ضابطۂ حیات کا نفاذ ناممکن ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ آپ ملک میں کسی اکثریتی فرقہ کی فقہ کا نفاذ کر دیں اور مطمئن ہو جائیں کہ اسلام کا نفاذ عمل میں آ گیا ہے۔ تو یہ بھی اسلام کے ساتھ اور قوم کے ساتھ بددیانتی ہوگی نیز موجب فساد۔

میں جب قوم کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو میرے سامنے خاک وخشت کے ساتھ وابستگی یا نسل، خون، رنگ کی تفریق ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ ایک نظریہ پر اکٹھے عمل کرنے والوں کو میں قوم کہتا ہوں۔ اگر اس نظریے میں دراڑیں۔۔۔ موجود ہیں تو پھر ٹکڑیاں تو ہو سکتی ہیں قوم نہیں ہو سکتی۔ میرے نزدیک حبشی بلال اور سلمان فارسی ایک ہی قوم کے دو فرد تھے۔ جبکہ عمر فاروق اور ابوجہل دو مختلف قوموں کے افراد تھے۔

مسلمان کی تعریف (Definition) طے ہو جانے کے بعد حکومت کے لئے اسلامی ضابطہ حیات کے نفاذ کے لئے قانون سازی آسان ہو جائے گی۔ اس کے بعد ملک کا ہر فرد جو اپنے آپ کو مسلم کہلاتا ہے یا کہلانا چاہتا ہے اس کے لئے مرکز کی طرف سے نافذ کئے گئے تمام قوانین بشمول مسلمان کی تعریف (Definition) کی پابندی لازمی ہوگی۔ یاد رہے کہ قانون کا اطلاق ملک کے ہر شہری پر یکساں طور پر ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہئے ''بائیں چلو'' تمام ملک میں ٹریفک کا ایک معروف ضابطہ ہے۔ جو بھی اس کی خلاف ورزی کرے گا اس ضابطہ کی زد میں آ جائے گا۔ اب یہ ہمارے ایمان کا حصہ بن چکا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ملک کا کوئی شہری یا کوئی گروہ یہ کہے کہ میں یا میری جماعت ''بائیں چلو'' کا قانون تسلیم نہیں کرتی ہم تو ''دائیں چلو'' کے ضابطہ پر عمل کریں گے یہ قانون سے بغاوت ہوگی اور فساد فی الارض.....

والسلام

آفتاب عروج

☆☆☆

۱۴ ستمبر

مکرمی آفتاب عروج صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا ارسال کردہ مراسلہ موصول ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک اصل مسئلہ ایک اسلامی ریاست کا قیام ہے نہ کہ مسلم کی Definition کا۔ اگر کہیں دنیا میں صحیح معنوں میں ایک اسلامی ریاست قائم ہوگئی تو وہی مسلم کی Definition بھی طے کرے گی۔

شکریہ

والسلام

سردار اعوان

(معتمد ذاتی ڈاکٹر اسرار احمد)

☆☆☆

باسمہ تعالیٰ

مکرمی ومحترمی سردار اعوان صاحب

معتمد ذاتی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم!

میرا ایک کھلا خط (مسلم کی تعریف Definition) گزشتہ سال ۳۱ اگست ۱۹۹۹ء کو روزنامہ خبریں میں شائع ہوا تھا۔ اس کی ایک نقل میں نے خصوصی طور پر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی خدمت میں اس امید پر ارسال کی تھی کہ وہ بھی نظام خلافت (کسی بھی نظام کو قائم کرنے کے لئے فکر وعمل کی ہم آہنگی از بس ضروری ہوتی ہے) کے لئے مسلسل برسر پیکار ہیں۔ اس لئے یقینی طور پر اس بے حد مشکل اور پیچیدہ صورت حال پر بہتر طور پر میری رہنمائی فرمائیں گے۔ مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۹۸ء کو جناب اسرار احمد کے ذاتی معتمد کی حیثیت سے آپ نے اس خط کا جواب ارسال فرمایا تو مجھے بے حد مایوسی ہوئی۔ آپ کے نزدیک اصل مسئلہ اسلامی ریاست کے قیام کا ہے نہ کہ مسلم کی تعریف (Definition)۔

کوئی بھی انسانوں کی جماعت، انجمن، گروہ یا ریاست افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ بذات خود ریاست اپنا علیحدہ کوئی وجود نہیں رکھتی۔ یہ عام فہم بات ہے۔ اس انجمن، جماعت، گروہ یا ریاست کے باسی آپس میں مل کر کچھ اصولوں پر تحریری یا غیر تحریری معاہدہ عمرانی پر متفق ہو جاتے ہیں کہ آئندہ ہم آپس میں ان قواعد وضوابط کی روشنی میں زندگی کے معاملات چلائیں گے اور ہم میں سے کوئی بھی ان قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ پھر اس معاہدہ عمرانی کا کوئی سا نام بھی تجویز کر لیتے ہیں (ہم اس وقت سمجھنے کی خاطر اس کا نام جمہوری طرز زندگی رکھ لیتے ہیں)۔

اس کے برعکس آپ ایک اسلامی ریاست کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ سوال پھر وہی ہو گا کہ اسلامی ریاست کیا ہے؟؟؟ آپ کے نزدیک وہ کون کون سے لوازمات ہیں یا کون کون سے تقاضے ہیں جن کے ادا کر دینے سے ریاست مسلمان ہو جائے گی یا اسلامی کہلائے گی۔ آپ کی مجوزہ اسلامی ریاست کوئی ٹھوس، جامد مادی شے نہیں ہے جس کا ہم سب لوگ کھوج لگا رہے ہوں۔ جیسے ہی وہ کہیں سے دریافت ہو جائے گی، اس کا اعلان کر دیا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ آپ کی مجوزہ اسلامی ریاست کسی خطہ زمیں پر افراد انسانی کا مجموعہ ہو گی۔ ان لوگوں کا کوئی رہن سہن اور زندگی گزارنے کے رنگ ڈھنگ اور طور طریقے بھی ہوں گے۔ فرد کے انفرادی اور اجتماعی حقوق وفرائض بھی ہوں گے جن کے تابع وہ لوگ ازخود اپنے طور پر اتفاق رائے سے ان اصولوں کے اندر رہتے ہوئے ایک عمرانی معاہدہ کر کے اپنے لیے ایک متفق علیہ حد فاصل کا تعین کریں گے۔ پھر اس متفق علیہ حد فاصل کے اندر رہتے ہوئے کوئی بھی فرد اس انجمن، جماعت یا بقول آپ کے ریاست کا رکن بن سکتا ہے۔ بصورت دیگر اگر کوئی فرد اس متفق علیہ حد فاصل کو نہیں تسلیم کرتا یا اسے توڑ دیتا ہے جو اس انجمن نے یا ریاست نے مقرر کر رکھی ہے تو وہ فرد اس انجمن، جماعت یا ریاست کا رکن نہیں بن سکتا وغیرہ۔ اس خط میں میرا منشاء بھی اسی متفق علیہ حد فاصل کے تعین کا تھا اور اب ان سطور میں بھی میں نے اسی متفق علیہ حد فاصل کے تعین کا اعادہ کیا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے دینی و مذہبی پیشواؤں کی غالب تعداد کا سب سے کمزور ترین پہلو اس اعتراف حقیقت سے انکار ہے کہ کم از کم گزشتہ ہزار برس کے دور ملوکیت و آمریت نے دین اسلام کی شکل بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ دین اسلام اس قدر زنگ آلود ہو چکا ہے کہ اس کی حقیقی تصویر کسی کے بھی سامنے نہیں ہے۔ پاکستان کا قیام اسی دور ملوکیت اور آمریت کے اسلام پر لگائے گئے زنگ کو کھرچ کھرچ کر

اتارنے اور حقیقی خلافت علیٰ منہاج نبوت کا قیام تھا۔ اب ہر دینی و مذہبی پیشوا اس زنگ آلود اسلام سے ہی تصویر کشی کرنے کی کوشش میں ہے جس میں وہ کامیاب نہیں ہو رہا۔ آج اگر کوئی سر پھرا جنونی مسلم اس زنگ زدہ اسلام کا زنگ اتارنے کی کوشش کرتا ہے یا آئندہ کرے گا تو یہی دینی و مذہبی پیشوایان اسے فوری طور پر کافر قرار دے دیں گے۔ کم از کم گزشتہ پچاس سالہ تجربہ میری مذکورہ دلیل کا شاہد ہے کہ پاکستان میں جس قدر بھی دینی و مذہبی جماعتیں اسلامی نظام یا اسلامی انقلاب کا نعرہ لے کر اٹھیں وہ ناکام رہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہر ایک جماعت کا الگ الگ تصور اسلام ہے۔ اور وہ اب بھی اپنے گروہی یا فرقہ وارانہ نظریات سے کسی طور پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں۔ ان کا یہ طرز عمل خود ان کے اپنے دعوی اسلامی نظام یا اسلام کی نفی کرنے کے لیے کافی ہے۔

اس پر انہوں نے اپنی ناکامی چھپانے کی غرض سے اسلام پر اور پاکستانی قوم پر مزید ظلم یہ کیا کہ حکومت پر دباؤ ڈال کر آئین کی ذیلی دفعہ 277 کے ذریعے اپنے اپنے گروہ یا فرقہ کو تحفظ دلانے میں کامیاب ہو گئیں اب رہی وہ دکھتی رگ مسلم کی تعریف (Definition) جس سے یہ گریزاں ہیں۔ کیونکہ اس کے طے ہو جانے سے قوم میں اتحاد پیدا ہو جائے گا اور ان کا اپنا وجود باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے میں نے اپنے گزشتہ سال کے خط میں یہ تجویز دی تھی کہ ہم گزشتہ نصف صدی سے خود کو اور قوم کو دھوکہ دیتے چلے آ رہے ہیں (کیا ہم اللہ تعالیٰ کو بھی دھوکہ دے پائیں گے؟؟؟)۔ اب یہ تماشہ بند ہو جانا چاہئے۔ اگر ہم گزشتہ پچاس سالوں میں مسلم کی تعریف Definition پر ہی متفق نہیں ہو سکے تو اسلامی نظام پر اتفاق تو بہت دور کی بات ہو گی۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہمیں اپنی ناکامئ حقیقت کا اعتراف کرنے میں شرم محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں برملا مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم جیسی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ اعلان کر دینا چاہئے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے جو موجودہ زمانوں کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا لہٰذا آئندہ کسی بھی شخص یا پارٹی کو اسلام و شریعت کے نام پر ملک میں فتنہ و فساد برپا کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔

اگر ہم یہ کام (مسلم کی تعریف Definition) نہیں کر سکتے تو پھر کوئی دوسری قوم یہ کام کر دکھائے گی۔ جب ہماری حالت دیدنی ہو گی۔ ہم ندامت کے جہنم میں ڈوب چکے ہوں گے اور ہماری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر طرف سے منہ موڑ کر قوم میں فکر و عمل کی ہم آہنگی کی صورت پیدا کرنے کے لیے کام کیا جائے۔ امید ہے کہ آپ میری ان معروضات پر غور فرما کر میری رہنمائی فرمائیں گے۔

والسلام

آفتاب عروج

☆☆☆

بسم تعالیٰ

۱۳ اکتوبر ۹۹ء

مکرمی آفتاب عروج صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

آپ نے ایک سال بعد زحمت فرمائی' خیریت تو تھی۔ اسلامی ریاست کے بارے میں نمعلوم کیوں آپ کو Confusion ہے؟ ظاہر ہے دستور میں طے ہو جائے کہ یہاں قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون سازی نہیں ہو گی تو قانوناً یہ ملک اسلامی ریاست بن جائے گا۔ آپ نے لکھا ہے کہ ''اگر ہم یہ کام (مسلم کی Definition) نہیں کر سکتے تو پھر کوئی دوسری قوم یہ کام کر دکھائے

گی.....'' ہم سے آپ کی کیا مراد ہے؟ یعنی کس سے آپ یہ کام کروانا چاہتے ہیں۔

حضور یہ طے کرنا اسلامی ریاست کی ضرورت ہے کہ کون مسلمان ہے اور کون نہیں اور وہی اسے طے کرنے کی مجاز ہے۔

شکریہ

والسلام

سردار اعوان

(معتمد ذاتی)

☆☆☆

محترم سردار اعوان صاحب

معتمد ذاتی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

حضور نبی اکرمؐ کے دور ہمایوں اور خلافت راشدہ کے بعد میں نے معلوم اسلامی تاریخ کے کسی بھی دور میں اس خطہ ارض پر۔۔۔ مذہبی پیشوائیت کے کسی بھی فرد کو عملی طور پر انقلابی تبدیلی لا کر بطور نظام اسلامی یا اسلامی ضابطہ حیات کی قیادت و سیادت کرتے نہیں پایا۔ گزشتہ ہزار برس میں ایک منفرد واقعہ رونما ہوا کہ غیر روایتی مذہبی شخصیات (سرسید احمد خانؒ علامہ محمد اقبالؒ اور محمد علی جناحؒ) قوم کے سامنے نظریہ اسلام کی صحیح تعبیر پیش کر کے دین اسلام کے نام پر ایک خطہ زمین حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

مذہبی پیشوائیت کے لیے اس مملکت پاکستان کا دین کے نام پر وجود میں آنا ایک حادثہ سے کم نہ تھا۔ یہ حضرات نظام اسلامی' اسلامی ضابطہ حیات یا اسلامی انقلاب کی اصطلاحات سے بالکل نابلد تھے۔ ان کا اسلام محض اپنی اپنی فقہ کے مطابق نماز' روزہ' حج' وضو' طہارت اور غسل وغیرہ کے احکامات تک محدود تھا اور اب اس آزاد فضا میں گزشتہ باون سال سے اس حادثہ سے سنبھل نہیں سکے۔ اس وقت بھی ان کے اردگرد کی معاصر دنیا میں کیسی کیسی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ کون کون سے زمانہ حال کے تقاضے ابھر کر ہمارے سامنے آ کھڑے ہیں۔ ایک ماہ بعد اکیسویں صدی کا آغاز ہونے کو ہے۔ معاصر اقوام کے بالمقابل ہمارا قومی وملی کردار کا ماحصل کیا ہوگا۔ یہ اس کا ادراک نہیں کر پا رہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد ابھی تک اسلامی ریاست کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ مسلم کسے کہتے ہیں۔ اس سے بڑا المیہ' اس سے بڑی ندامت کیا ہو سکتی ہے کہ اسلام کے نام لیواؤں کو یہ تک نہیں معلوم کہ مسلم کی تعریف کیا ہے؟

۱۴ ستمبر ۹۸ء کے خط میں آپ کے نزدیک اصل مسئلہ ایک اسلامی ریاست کے قیام کا تھا نہ کہ مسلم کی تعریف۔ اگر کہیں دنیا میں صحیح معنوں میں ایک اسلامی ریاست قائم ہو گئی تو وہی مسلم کی تعریف طے کرے گی۔ عرض کیا گیا اسلامی ریاست کی تعریف کر دیجئے۔ ۱۳ اکتوبر ۹۹ء کو تحریر کیا گیا کہ اگر دستور میں طے ہو جائے کہ یہاں قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون سازی نہیں ہوگی تو قانوناً یہ ملک اسلامی ریاست بن جائے گا۔ آپ کو یہ جان لینا چاہئے کہ آپ ایک صاحب علم ڈاکٹر اسرار احمد کے معتمد ذاتی ہیں۔ اس لیے آپ کو کم علمی کی باتیں زیب نہیں دیتی۔ آپ کی ہر تحریر ڈاکٹر اسرار احمد کی تحریر متصور ہوگی اور آپ کی کم علمی ڈاکٹر اسرار احمد کی کم علمی سمجھی جائے گی۔

کیا ڈاکٹر اسرار احمد کو یہ معلوم نہیں کہ دنیا میں پاکستان نام کی یہ واحد ریاست ہے جو کہ دین اسلام کی بنا پر وجود میں آئی ہے اور اس کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی یہ لکھ دیا گیا تھا کہ یہاں اقتدار اعلیٰ اللہ کا ہوگا۔ اب آپ نے لکھ دیا ہے کہ اگر دستور میں یہ طے ہو جائے کہ یہاں قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون سازی نہیں ہوگی تو یہ ملک قانوناً اسلامی ریاست بن جائے گا۔ اس سے بڑھ کر مغالطہ آفرینی کیا ہو سکتی ہے۔ صاحب علم لوگ دلیل و برہان سے بات کرتے

ہیں مفروضوں کے سہارے نہیں ڈھونڈتے۔

آپ فرماتے ہیں کہ یہ طے کرنا اسلامی ریاست کی ضرورت ہے کہ کون مسلمان ہے کون نہیں۔ محترم محمد سردار اعوان صاحب! میں نے اپنے اگست ۹۸ء کے عریضہ میں ۱۹۵۳ء میں فسادات پنجاب پر حکومت پنجاب کیطرف سے مقرر کی گئی تحقیقاتی عدالت کا فیصلہ جسے بعد میں جسٹس منیر کمیٹی رپورٹ کہا گیا اس کا حوالہ دیا تھا جس میں تحریر کیا گیا ہے کہ شیعہ اور سنی' اہل حدیث' بریلوی اور دیوبندی لوگوں میں سے کوئی بھی مسلم نہیں ہے۔ (میں نے اپنے خط ۹۸ء کا اقتباس دوبارہ اس خط کے ساتھ لف کیا ہے اسے دوبارہ دیکھ لیجئے گا) موجودہ حالات میں کسی بھی حکومت کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی طرف سے مسلم کی تعریف کر دے۔ جب تک متفقہ طور پر تمام مذہبی جماعتیں اس مسئلہ پر بحث و مباحثہ کے بعد مشاورت کے ساتھ مسلم کی تعریف پر اتفاق رائے نہ پیدا کر لیں۔ اسی کنفیوژن کو دور کرنے کی غرض سے میں نے تمام مذہبی جماعتوں کے سربراہوں کو خطوط ارسال کیے تھے جن کا دو ایک کے سوا مجھے کسی نے بھی جواب نہیں دیا۔ اب یہی کنفیوژن آپ میری طرف لوٹا رہے ہیں۔ اسی کنفیوژن کی وجہ سے ضیاء الحق دور میں دستور کے آرٹیکل 227 میں یہ اعتراف شکست کیا گیا تھا کہ حکومت اپنی طرف سے مسلم کی تعریف نہیں کر سکتی لہٰذا ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق مسلم کی تعریف کر سکتا ہے۔ کیا اب بھی آپ کو میری بات سمجھ نہیں آ رہی؟ مزید یہ کیا آپ حکومت پاکستان کو یہ لکھ کر دے سکتے ہیں کہ ہم حکومت کی طرف سے طے کی گئی مسلم کی تعریف قبول کرنے کا اعلان کرتے ہیں باقی فرقے بھی ہماری پیروی کریں۔

آپ کا یہ ارشاد کہ ''ہم'' سے آپ کی کیا مراد ہے؟ یعنی آپ کس سے یہ کام کروانا چاہتے ہیں۔ آرزو تو میری یہی ہے کہ پاکستانی قوم کے علماء کرام (اگر وہ واقعی علماء ہیں تو) جلد از جلد اس مسئلہ (مسلم کی تعریف) پر سنجیدگی سے توجہ فرمائیں اور اس کا سب کے لیے قابل قبول حل تلاش کر کے حکومت کو پیش کر دیں تا کہ ملک میں آئے دن کا انتشار و افتراق ختم ہو سکے۔ بصورت دیگر اگر اس مسئلہ (مسلم کی تعریف) سے پہلوتہی کی گئی اور اللہ کی طرف سے ہمارے لیے مہلت کا وقت ختم ہو گیا تو اللہ تمہاری جگہ ایک اور قوم لے آئے گا جو تم جیسی نہیں ہو گی اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔

والسلام

آفتاب عروج

☆☆☆

باسمہ تعالیٰ

۹ دسمبر ۹۹ء

مکرمی آفتاب عروج صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا مراسلہ' محررہ یکم دسمبر موصول ہوا۔ آپ کھل کر ارشاد فرمائیں' اللہ تعالیٰ تو یقیناً جو چاہے کر سکتا ہے لیکن آپ کے کیا ارادے ہیں۔ یہ بتائیے۔

آپ ہمیں کم علم سمجھتے ہیں تو اس میں جھگڑے والی کون سی بات ہے' ہم نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ علم صرف ہمارے پاس ہی ہے۔ ویسے بھی ہمارا تعلق نہ تو مذہبی پیشوائیت سے ہے اور نہ کسی فرقہ سے لہٰذا ہمارے ساتھ آپ کا کوئی مسئلہ بنتا نہیں۔ آپ نے شاید غلط طرف رخ کیا ہے۔

والسلام

سردار اعوان

(معتمد ذاتی)

☆☆☆

باسمہ تعالیٰ

میرے محترم سردار اعوان صاحب

السلام علیکم!

میں اپنی لمبی چوڑی تحریر پر مشتمل تین خطوط آپ کی خدمت اقدس میں ارسال کر چکا ہوں۔ اس کے باوجود آپ کا تقاضا ہے کہ میں کھل کر بات کروں؟ مجھے آپ کے اس جملہ پر بے حد حیرت ہوئی ہے۔ یہ جملہ تو مجھے لکھنا چاہیے تھا جو میں نے آج تک نہیں لکھا۔ میری گزشتہ تمام خط و کتابت کا نقطہ ماسکہ یہ تھا کہ اگر ہم اس مملکت میں اسلامی ضابطہ حیات کا نفاذ چاہتے ہیں تو ظاہر ہے اس کے لئے ہمیں قانون سازی کرنی پڑے گی۔ جب ہم قانون سازی کا آغاز کریں گے تو سب سے پہلا مرحلہ ہمارے سامنے مسلم کی تعریف کا ہوگا۔ جس طرح ہمارے پاس پاکستانی شہری کی تعریف موجود ہے (اس میں ہندو مسلم سکھ عیسائی یہودی پارسی اور مرزائی یا قادیانی وغیرہ کی تخصیص نہیں) میری دانست میں ان ڈھیر سارے فرقوں کی موجودگی مسلم کی تعریف طے کرنے میں سد راہ ہے اس لئے اس مملکت میں اسلامی ضابطہ حیات کا خواب اس وقت تک شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا جب تک ہم ان تمام فرقوں کو ختم کر کے کوئی متفق علیہ مسلم کی تعریف طے نہیں کر لیتے۔ آپ کے نزدیک اس کا کیا حل ہے؟ اب آپ بتائیے میری اس تحریر میں کیا الجھن یا ابہام ہے؟ جس پر مزید کھل کر بات کی جا سکے۔ میرے ان تمام خطوط کے جواب میں آپ میرے سوال یا نقطہ نظر کی تردید کر سکتے ہیں یا تائید یا پھر آپ اپنی طرف سے مسلم کی تعریف لکھ کر بھیجتے۔ لیکن آپ نے دانستہ پہلو تہی کر کے گول مول جوابات ارسال کئے۔ کبھی آپ نے فرمایا کہ جب بھی دنیا میں کوئی مسلم ریاست وجود میں آ گئی تو وہی مسلم کی تعریف کرنے کی مجاز ہوگی۔ جب آپ سے مسلم ریاست کی تعریف کرنے کو کہا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر ہمارے ملک کے آئین میں یہ لکھ دیا جائے کہ یہاں قرآن وسنت کے منافی قانون سازی نہیں ہوگی تو ہماری ریاست مسلم ہو جائے گی۔ جب عرض کیا گیا کہ ہمارے ملک کے آئین میں تو یہ لکھا ہوا ہے کہ یہاں قرآن وسنت کے منافی قانون سازی نہیں ہوگی (اس کے باوجود ہمارا آئین وقانون تمام کا تمام سیکولر ہے) تو اب آپ نے فرما دیا ہے کہ ہمارا تعلق مذہبی پیشوائیت سے ہے نہ کسی فرقہ سے لہٰذا ہمارے ساتھ آپ کا کوئی مسئلہ نہیں بنتا۔ آپ نے شاید غلط رخ اختیار کیا ہے۔

میں معذرت خواہ ہوں مجھے ہرگز ہرگز یہ معلوم نہ تھا کہ موجودہ مسلمانوں کے علاوہ بھی کوئی ایسی انجمن اپنا وجود رکھتی ہے جو خدام قرآن ہوتے ہوئے بھی قرآن سے کوئی علاقہ یا تعلق نہ رکھتی ہو۔ کیا یہ کوئی اشاعتی ادارہ ہے جہاں پر قرآن کریم کی چھپائی اور جلد بندی وغیرہ ہوتی ہے۔ میری ناقص معلومات میں اضافہ فرما دیجئے ممنون ہوں گا۔

والسلام

آفتاب عروج

☆☆☆

(مکرمی آفتاب عروج صاحب)

السلام علیکم!

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(ابن مریم)

مزدکیت فتنہ فردا نہیں

علامہ اقبالؒ کی شاعری کے ابتدائی زمانے کا ایک شعر ہے'

کھول کر آنکھیں میرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اس کی تفسیر بعد میں آنے والے دور میں ہمیں جگہ جگہ نظر آتی ہے' یورپ میں قیام کے دوران انہوں نے مغرب کے معاشرے' ان کی اقدار' ان کی ترقی کا بنظر غائر مطالعہ کیا' اور اس کی کمزوریوں کا بھی۔ طویل جدوجہد کے بعد مغرب نے مذہب کو کلیساؤں کے اندر بند کر دیا تھا' مشینی انقلاب نے انہیں مادی ترقی کی راہ پہ ڈال دیا تھا' اسی زمانے میں انہوں نے نوٹ کر لیا تھا کہ۔

گرجوں سے کہیں اونچی ہیں بنکوں کی عمارات

دوسری طرف مشینی ترقی نے انکی سوسائٹی اور اقدار پہ جو اثر کیا تھا انہوں نے اسکا یوں اظہار کیا'

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

صنعتی ترقی اور مشینی دور کا نتیجہ منڈیوں کی تلاش اور استحصال کا کلچر تھا ان کی ساری ترقی اسی پر مبنی تھی' خود کو سب سے مہذب اور بہتر سمجھتے ہوئے پس ماندہ اقوام کی ترقی میں امداد کے زبانی پروگرام اور انسانی حقوق کی پاسداری کے دعوے۔۔۔۔! علامہ جانتے تھے کہ یہ سب دکھاوا تھا۔

پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

مغرب اور مغربی تہذیب کی چمک دمک اور بلند بانگ دعاوی انہیں متاثر نہ کر سکے:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ

اس تہذیب کا کھوکھلا پن اور انسانی اور اخلاقی اقدار پہ اس کے اثر کو دیکھتے ہوئے ان کا وہ خیال جس کا اظہار وہ بہت پہلے یوں کر چکے تھے کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

اور پختہ ہو گیا۔

یہ شاخ نازک زندگی کا وہ فلسفہ تھا جو مغرب کے استعماری نظام کی بنیاد اور روح رواں تھا۔۔

یہ فلسفہ مغرب کے سرمایہ پرستانہ جمہوری نظام اور اس کے ردعمل میں ابھرنے والی اشتمالی تحریک میں مشترک تھا جو انسانی مساوات کا نعرہ لے کر سامنے آئی تھی' جو مزدوروں اور دوسرے پسے ہوئے طبقوں کے حقوق کی علمبردار ہونے کی دعویدار تھی اس حد تک تو وہ متفق تھے کہ:

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

مساوات کا نعرہ تو بجا مگر یہ کیسے ممکن ہو' ردعمل کے طور پر جذباتی انداز میں سرمایہ داری کے خلاف جنگ تو درست مگر سرمایہ داری کے محل کو گرانے کے بعد نئی عمارت کن خطوط پر استوار ہو گی کہ پائیدار بھی ہو' یہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔

اشتمالیت کے داعیوں نے اس کی معراج تو یہ بتائی کہ ہر کوئی اپنی استعداد کے مطابق کام کرے اور اپنی ضروریات کے مطابق لے۔۔مگر شروع ہی میں انہوں نے اعتراف کرلیا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہو گا وہ نہیں بتا سکتے۔

انسان آخر انسان ہے' جلد یا بدیر اس کے جذبات اسے اکساتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ جب میری ضروریات اتنے کام سے پوری ہوسکتی ہیں تو میں کیوں جان کھپاؤں' میں کیوں فالتو کام کروں خاص طور پر جب فالتو کام سے کمائی ہوئی دولت میرے کام نہیں آئے گی۔ فالتو سرمایہ میرا سرمایہ نہیں ہو گا۔ میری اولاد کے کام بھی نہیں آ سکے گا۔ میری ضرورت سے زیادہ ساری کمائی تو سٹیٹ لے جائے گی۔ سٹیٹ کو یہ حق کس نے دیا کہ وہ میری محنت کا ماحصل سمیٹ لے۔ چھین لے۔۔ کارخانے کے مالک نے استحصال نہ کیا سٹیٹ نے کرلیا۔ اور پھر یہ سٹیٹ ہوتی کیا ہے۔ چند لوگ ہی تو ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح برسر اقتدار آ جاتے ہیں اور اپنے کارندوں کے ذریعے حکومت چلاتے ہیں۔ میں کیوں فالتو کام کروں؟ میں کیوں دوسروں کو دینے کے لئے فالتو کام کروں۔ اس کا جواب اشتمالیت کے داعیوں کے پاس نہیں تھا۔ خود مارکس نے اعتراف کیا کہ آئیڈیل تو یہی ہے مگر یہ ممکن کیسے ہوگا میں نہیں جانتا۔ اس لئے ابھی سوشلزم سے کام چلایا جائے۔

اور دنیا نے دیکھ لیا کہ اس نظام کا علمبردار برزنیو برملا یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ اس نئی نسل کو جس کا استحصال سے واسطہ ہی نہیں پڑا کیا کہہ کر کام پر اکسایا جائے انہیں کام کے لئے جذبہ محرکہ کیا دیا جائے۔ سرمایہ داری نظام میں تو ذاتی منافع' دنیاوی سہولیات' تعیّشات بہت بڑا جذبہ محرکہ ہیں۔ نئی نسل کے اس کیوں کا جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ کسی کے پاس نہیں تھا۔ چنانچہ بیوروکریسی' انتظامیہ' پارٹی کے عہدیداروں اور سربرآوردگان کے ہاتھوں بادل ناخواستہ کام کرنے والا معاشرہ اپنی بے مثال سائنسی ترقی اور بے حساب سامان حرب و ضرب کے باوجود بادمخالف کے ہاتھوں کم اور اندرونی کمزوریوں کے باعث زیادہ ہاؤس آف کارڈز کی طرح بکھر کر رہ گیا۔

کمپیٹلزم۔۔ نظام سرمایہ داری نے بہت بغلیں بجائیں' کمیونزم کے زوال کو انہوں نے کمیونسٹ فلسفے کی کمزوری اور سرمایہ دارانہ نظام حکومت کی برتری کا ثبوت کہا۔ (بعینہ جیسے مغربی پاکستانیوں کے رویے اور بیوروکریسی کی ناانصافیوں کے ہاتھوں مجبور مشرقی پاکستانیوں کی علیحدگی کو اندرا گاندھی نے دوقومی نظریے کی ناکامی کا نام دیا۔ حالانکہ وہ بھی جانتی تھیں۔ ہم بھی جانتے تھے۔ ساری دنیا جانتی تھی کہ حقیقت کیا ہے۔

علامہ نے کمیونزم کے ابھرتے ہوئے دور ہی میں اس کی کمزوری کو جان لیا تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے سوال کیا تھا کہ۔

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جستہ ای اور را اساسِ محکمے

وہ اس کی کمزوریوں سے بخوبی آگاہ تھے'

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ
لا سلاطیں لا کلیسا لا الہ

لا' لا' لا' تخریب ہی تخریب ہے' درست ہے کہ غلط دیوار کو ڈھا کر ہی نئی دیوار کھڑی کی جاسکتی ہے۔ مگر تعمیر کیسی ہوگی اس کا بھی تو کچھ نقشہ ذہن میں ہونا چاہئے۔ زندگی صرف تخریب کے بل پر آگے نہیں بڑھ سکتی۔

درمیان لا نآساید حیات
سوئے الا می خرامد کائنات

کمیونزم روس کو' دنیا کو کام کے لئے کوئی (Incentive) جذبہ محرکہ نہیں دے سکا' وہ ورکر کے کیوں کا کوئی شافی جواب نہیں دے سکا۔ یہ جذبہ محرکہ کیا ہو' لگا بندھا معاوضہ۔ اور بس۔ نتیجہ۔ گراؤنڈ رئیلیٹی۔ یہ کہ اس وقت سرمایہ دارانہ نظام سپریم ہے' امریکہ اس کا علمبردار ہے۔ سارا یورپ' برطانیہ اور اس کے زیر اثر ممالک ان کے پیچھے پیچھے' یہ جو سب اپنے آپ کو فری ورلڈ (آزاد دنیا) کا نام دیتے ہیں۔ دنیا کو اب ایک

عالمی گاؤں کا نام دیا جا رہا ہے۔ خدا جانے کس نے ان کو یہ نام سجھایا ہے۔ بڑا ہی مناسب نام ہے' وہ خود بھی شاید اس کی باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتے یہ تو ہم سمجھتے ہیں۔ جاگیرداری نظام کے تحت زندگی گزارنے والے لوگ کہ گاؤں کا مالک ومختار ایک وڈیرہ یا جاگیردار ہوتا ہے۔ باقی سب اس کے کمی' کارندے' نوکر' چاکر ہوتے ہیں جو صرف اس کا حکم بجا لاتے ہیں۔ وہ جس کو چاہے اپنی زمینوں پہ رہنے دے' جسے چاہے اس حق سے محروم کر دے' طاقت اس کی غلام اور قانون اس کے ابرو کے اشاروں پہ چلتا ہے۔

'یاسر عرفات کو کھڈے لائن لگا دو' 'صدام کا تختہ الٹ دو' عراق ایران شمالی کوریا برائی کی مثلث ہے' طالبان اور القاعدہ فری ورلڈ کے لئے خطرہ ہیں' ایک شخص ہے جس کا نام اسامہ بن لادن ہے' جہاں بھی اس شباہت کا شخص نظر آئے اس علاقے پہ دور حاضر کی خطرناک ترین جنگی مشینری پوری تندہی سے حرکت میں آ جائے۔ نیک پاک دھلا دھلایا اگر کوئی ہے تو مظلوم امریکہ یا بیچارا اسرائیل ہے۔ کسی کو ان کے دامن پہ مظلوموں کے خون کے دھبوں کی نشاندہی کی اجازت بھی نہیں ہے۔ یہ دامن داغدار ہی نہیں لہو سے شرابور ہے' سفارتی زبان میں چھپا کر لاکھ دھوکا دہی کی کوشش کی جائے۔ صورت حال بولتی ہے۔ جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔۔

ظالم نے کس صفائی سے دھوئی ہے آستین
کم بخت جانتا نہیں ہے خُوں بولتا بھی ہے

یہ لہو ایڈورڈ سعید کی زبان میں بولے یا نام (نوم) چامسکی کی زبان میں۔۔ یہ زبان خلق ہے' لاکھ چھپاؤ' لاکھ پردے ڈالو' یہ ڈھول بجے ہی بجے' شور مچے ہی مچے' انگلیاں اٹھیں ہی اٹھیں۔ لاکھ لاف زنی کرو' بش کے لہجے کا غرور' ابرو کی شکن' رمزفیلڈ کی انسانی جذبات سے عاری لہجے میں گفتگو۔ زندہ یا مردہ فلاں کو پکڑو' بے نگاہ اتفاق زد میں آ کر مارے گئے۔ کون ہوتا ہے حریف امریکہ و بش۔۔ ۱۱ ستمبر سے پہلے بھی یہ سپریم تھے۔ کمیونزم کی پسپائی کو مدت گزر چکی تھی' کیا اس سے دنیا انسانوں کے لئے زیادہ پرامن پرسکون ہوگئی تھی' کیا اونچ نیچ' رنگ ونسل سے بلند تر معاشرہ نظروں کے سامنے تھا' کیا جرائم کی دنیا خستہ وخوار ہو رہی تھی' اخلاقیات کی بات چھوڑیں معاشی بدحالی دور ہوگئی تھی' تیسری دنیا اور بدحال پسماندہ ملکوں کے عوام کی آنکھوں میں ایک روشن مستقبل کا خواب چمک اٹھا تھا۔۔ نہیں اور یقیناً نہیں۔۔!

تو پھر کیا انسانیت اسی طرح اندھیروں میں بھٹکتی رہے گی؟

اجارہ داری' اکتناز' دولت کا اوپر کے طبقوں ہی میں گھومتے رہنا۔ دوسروں کی غربت پسماندگی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی ہوس۔۔ ایک طرف مساوات کے دعویداروں کا عجز کہ جذبہ محرکہ موجود نہیں۔۔ کام کرنے والے کا احتجاج کہ میں فالتو کام کیوں کروں جبکہ اس کا ماحصل میرا نہیں ہوگا۔

اس کیوں کا جواب خود مارکس نے کہا میرے پاس نہیں۔ کیا اس کیوں کا جواب کہیں ہے؟ کسی کے پاس ہے؟ جو میں کہنے والا ہوں اس پہ آپ حیران تو ہونگے مگر میرا جواب جو اثبات میں ہے' یقیناً سے شروع ہوتا ہے' یقیناً ہے۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ جن کے پاس اسکا جواب ہے وہ اس بلند فکری سے ناواقف ہیں یا پھر انہیں بات کہنے کی جرات نہیں' شاید اپنے موقف پہ غیر متزلزل ایمان مفقود ہے۔

نظام سرمایہ داری اور کمیونزم مسائل کا حل عقل سے ڈھونڈتے ہیں عقل کے پاس واقعی اس کا حل نہیں ہے عقل ہر انسان کی اپنی ہے' اپنی ذات کا حصہ وہ تو اسے صرف اپنا نفع نقصان سجھا سکتی ہے۔ اپنے مفادات کو بچانے' انہیں آگے بڑھانے کے طریقے بتا سکتی ہے' دوسروں پہ اس کا کیا اثر ہوگا اس سے اسے کوئی سروکار نہیں۔

دنیا کو بتانا ہے کہ عقل سے ماورا بھی ایک ذریعہ علم ہے' وہ انسانوں سے بلند تر ہستی کی طرف سے رہنمائی ہے' وہی اس کا حل بتا سکتی ہے۔۔ وہ ذریعہ علم ہے وحی خداوندی اور یہ رہنمائی اب اپنی اصلی اور منزہ شکل میں صرف اور صرف قرآن پاک کی شکل میں محفوظ ہے' اس کی دی ہوئی رہنمائی کا جھکاؤ کسی خاص انسانی گروہ کسی خاص طبقے

کے مفادات کی طرف نہیں' وہ چونکہ رب العالمین ہے۔ رب الناس ہے اس نے اس کے پیش نظر سب انسانوں' سب ملکوں' سب نسلوں' سب عالمین کی بھلائی یکساں محبوب ہے۔

انسان کی عقل کو علامہ عقل خود بیں کا نام دیتے ہیں اور وحی عقل جہاں بیں ہے' وسعت نظر کا فرق ظاہر ہے اس کیوں کا جواب صرف اور صرف فلسفہ آخرت میں ہے' اس بات پر ایمان ہے کہ یہ زندگی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی' یہ ندی ایک موڑ مڑ کر اور میدان میں داخل ہو جاتی ہے۔

Dust thou art, to dust returneth

ایک غلط سوچ ہے' زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد باد' مکافات عمل کے فلسفے کے بغیر کوئی اور فلسفہ انسان کو یہ حوصلہ نہیں بخش سکتا کہ وہ دوسروں کی بھلائی کے لئے کوئی کام کر سکے۔ جسے یہ معلوم ہو کہ اس زندگی میں کئے ہوئے اعمال کے بل ہی پہ اسے آئندہ زندگی میں کوئی مقام عطا ہو سکتا ہے' وہی نیک و بد اعمال میں امتیاز کی ضرورت کو سمجھے گا جسے یقین ہو گا کہ کسی کا کوئی عمل رائیگاں نہیں جائے گا اور صالح اعمال وہی ہیں جو دوسروں کی بہتری کے نقطہ نظر سے کئے جائیں۔ اس سے دوسروں ہی کا فائدہ نہیں خود اس کی خودی پختہ تر ہو گی۔ خودی جو موت کے ساتھ مرتی نہیں۔

یہ بھی ایک سودا ہے جو اللہ سے کرنا ہوتا ہے جیسے کسان زمین میں بیج بوتے وقت دل میں یقین رکھتا ہے کہ مناسب نگہداشت کے ساتھ وقت پر اس میں سے پودا اگے گا۔ گندم کا بیج ہے تو اس میں ایسے خوشے لگیں گے جس میں گندم کے بے حساب دانے ہوں گے۔ اس طرح ایک بیج کو زمین میں دبا دینا مہنگا سودا نہیں۔ بعینہٖ اسی طرح دوسروں کی بہتری کے لئے کیا ہوا کام اس دنیا میں بھی (اور اگر بظاہر نہیں بھی) تو اگلی دنیا میں یقیناً برگ و بار لائے گا۔

جب تک اس فلسفہ کے ماننے والے اسے دنیا میں عام نہ کریں گے۔ (اور یہ کوئی آسان کام نہیں۔۔) اس دنیا کے حالات بہتر نہیں ہو سکتے۔

کمیونزم کے زوال سے تو دنیا میں کوئی انقلاب نہیں آیا مگر سرمایہ داری کی دنیا پہ اجارہ داری انسانیت کے لئے قیامت سے کم نہ ہو گی' ہم جیسے جاگیردارانہ نظام میں رہنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب ساری دنیا پہ ایک وڈیرے' ایک جاگیردار ایک فرعون کی حکومت ہو گی تو کمی' کمینوں' کارندوں کا کیا حال ہو گا۔

مساوات کا پیغام کہیں سے بھی اٹھے گا تو یہ وڈیرا' یہ فرعون اس کو اپنے لئے ایک چیلنج سمجھے گا' دنیا میں اٹھنے والی مختلف تحریکوں کا جائزہ لیتے ہوئے علامہؒ نے ابلیس کی مجلس شوریٰ میں قائد مجلس شوریٰ' ابلیس کی زبان سے جہاں یہ کہلوایا ہے۔ کیا ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کو چہ گرد و ہیں یہ کہلوایا ہے کہ ہے خطر مجھ کو تو اس امت سے ہے۔

ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں

اسی لئے اس نے اپنے چیلے چانٹوں سے کہا تھا کہ

مزدکیت فتنۂ فردا نہیں' اسلام ہے

انسانی مساوات' انصاف' رنگ و نسل سے بلند تر ہو کر پوری انسانیت کے فائدے' خوف اور حزن سے آزادی کی سوچ معاشی ہے۔ فکری خوشحالی اور امن کا پیغام لے کر جب بھی کوئی قوم اٹھے گی' یہ فرعون' قارون' جنود ہامان سمیت اس کی مخالفت میں اٹھیں گے۔

لاکھ دبائیں' لاکھ جبر کریں لیکن یہ آواز اٹھے گی ضرور' کہ یہ زمانے کا تقاضا ہے' علامہ اقبال نے کہا تھا۔

انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
جو حرف قل العفو میں پوشیدہ تھی اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

کیونکہ جب بھی اس امت نے ام الکتاب سے زمانے میں پنپنے کے لئے رہنمائی مانگی تو اسے وہاں سے ساری انسانیت کے لئے مساوات اور آزادی کا پیغام ملے گا۔ اور اگر اس نے اس پیغام کو عام کرنے کا عزم کیا تو اسے جن جن سمتوں سے مخالفت کا سامنا کرنا ہو گا اسے تصو رمیں لانے کے لئے ایسی دقت نہیں ہونی چاہئے۔

(اس کا ذکر ہم اگلی صحبت پہ اٹھا رکھتے ہیں)۔

''وعظِ جدید!''

ہر مسلماں پر نمازِ پنجگانہ فرض ہے — تاکہ یہ باقاعدہ ورزش حیات انگیز ہو

غور سے دیکھیں تو روزے کا بھی مقصد ہے یہی — تندرستی کا سبب یہ عادتِ پرہیز ہو

مدّعا یہ ہے جو اہلِ زر پہ واجب ہے زکوٰۃ — ہر ادارے کا خزانہ نقد سے لبریز ہو

اس لئے حج کے سفر کا ہے مسلمانوں کو حکم — تاکہ ان کا جذبۂ سیر و سیاحت تیز ہو

رسمِ قربانی کا بھی دراصل یہ مقصود ہے — مردِ مومن جنگ میں سنگیں دل و خونریز ہو

جنت و دوزخ سے ہے اک صورتِ امید و بیم — تاکہ یہ ذوقِ عمل کے واسطے مہمیز ہو

کوہکن ہیں ہم اُسی عقبیٰ کی جوئے شیر کے — جس سے دنیا ہی میں حاصل شوکتِ پرویز ہو

یوں نئے واعظ بیاں کرتے ہیں اس کی حکمتیں
دین جیسے اک دروغِ مصلحت آمیز ہو!

☆☆☆

اسدؔ ملتانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

زہر کھانے والے کا انجام ہلاکت کیوں ہے؟ اس لئے کہ زہر طبع انسانی کے خلاف ہے۔ تہ آب بیٹھ جانے والے کے لئے موت کیوں یقینی ہے؟ اس لئے کہ اس نے اپنے آپ کو اس ہوا سے جس پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے محروم کرلیا ہے۔ لہلہاتی کھیتی کو پانی نہ دیا جائے تو وہ خشک کیوں ہو جاتی ہے؟ اس لئے کہ پانی' جو اس کی زندگی کا سرچشمہ ہے اس سے روک لیا گیا ہے۔ جہاں جہاں آپ ہلاکت اور موت دیکھیں گے اس سے پہلے کہیں نہ کہیں کوئی خلاف فطرت اثر کارفرما نظر آئے گا۔ شجر وحجر اور حیوانات کی زندگی طبعی قوانین کے تابع چلتی ہے۔ لیکن انسانی زندگی طبعی قوانین کے علاوہ اس نظام کے بھی تابع ہے جو اس نے اپنے اوپر مسلط کر رکھا ہے۔ اس نظام کا اثر طبعی قوانین سے بھی زیادہ دوررس اور یقینی ہوتا ہے۔ جب یہ نظام زندگی اور آئین حیات فطرتِ انسانی کے مطابق ہوتا ہے تو اس کے نتائج حیات بخش اور انسانیت آفریں ہوتے ہیں جب وہ خلافِ فطرت ہوتا ہے تو اس کے عواقب ہلاکت انگیز اور تباہ کن ہوتے ہیں۔ طبعی زندگی اس دنیائے آب وگل تک محدود ہے۔ لیکن انسانی زندگی کا آخری مقام دنیا کی سرحدیں نہیں۔ یہ اس سے آگے بڑھنے والی ہے۔ اس لئے نظام زندگی کے اثرات وعواقب بھی اس سے آگے بڑھتے ہیں۔ خلاف فطرت نظام زندگی کے وہ دردناک نتائج جو حیات اخروی میں نمودار ہوتے ہیں' قرآن کریم انہیں جہنم اور عذاب النار سے تعبیر کرتا ہے۔ اس عذاب کی حقیقت کیا ہے؟ اسے آج کوئی نہیں بتا سکتا۔ اس پر ہمارا ایمان ہے اور علیٰ وجہ البصیرت ایمان۔ لیکن اس عذاب کا جو حصہ دنیا میں مرتب ہو جاتا ہے وہ تو ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ یہ وہ جہنم اور آگ کا عذاب ہے جس میں آج قریب قریب ساری دنیا جھلس رہی ہے اور انسان باوجود اپنی تمام اجتماعی قوتوں کے اسے اپنے اوپر سے ہٹا نہیں سکتا! ہر قوم چاہتی ہے کہ اس عذاب سے بچ نکلے۔ لیکن اس کے شعلے اتنے دوررس اور عالمگیر ہیں کہ کسی کو ان کی لپیٹ میں آئے بغیر چارہ نہیں۔ انسانی قوت اور بے بسی کے تضاد کا یہ مظاہرہ ہر دیدۂ عبرت کے لئے اپنے اندر ہزار سامان موعظت رکھتا ہے۔ قرآن کریم نے خلاف فطرت نظام زندگی کا نام شیطانی اور طاغوتی نظام قرار دیا ہے۔ یعنی ہر غیر خدائی نظام ابلیسی نظام ہے اور ایسے نظام کی اتباع کرنے والوں کا انجام جہنم ہے۔ اس دنیا میں بھی جہنم اور اس کے بعد کی زندگی (حیات اخروی) میں بھی جہنم۔ وہاں بھی آگ اور یہاں بھی آگ۔ انسان کو اس غیر خدائی نظام اور اس کے عواقب واثرات سے پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا اور اس آگہی کی یاددہانی کے لئے وقتاً فوقتاً ان کے پاس منذرین ومبشرین حضرات (علیہم السلام) تشریف لاتے رہے۔ چنانچہ ابلیس کی اولین سرکشی کے وقت ہی اس امر کا اعلان کر دیا گیا کہ

> ان عبادی لیس لک علیہم من سلطن الا من اتبعک من الغوین ٥ وان جہنم لموعدہم اجمعین (۴۲۔۴۳/۱۵)۔
>
> جو میرے مخلص بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں چلے گا۔ صرف انہیں پر چلے گا جو (صراط مستقیم یعنی نظام خداوندی کی راہ سے) بھٹک گئے اور ان سب کے لئے جہنم کے عذاب کا وعدہ ہے (جو کبھی ٹلنے والا نہیں)

خدا کے مخلص بندوں کی نشانی یہ ہے کہ وہ کسی ایسے نظام کو اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیتے جو اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت کے تصور پر مبنی ہو۔ وہ

بلاشرکت غیرے۔ خالصتاً اللہ کی حاکمیت کے تابع رہتے ہیں۔

قل انی امرت ان اعبد اللہ مخلصاً لہ الدین ۝ (۳۹/۱۱)۔

(اے رسول) ان سے کہدے کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اطاعت کو صرف اللہ کے لئے مختص کر کے اسی کی محکومیت اختیار کروں۔

اس کے خلاف جو لوگ من دونہ (۳۹/۱۵) اللہ کے علاوہ کسی اور کی حاکمیت تسلیم کر کے اس غیر خدائی نظام کو اپنے اوپر مسلط کر لیتے ہیں' ان کی روش زندگی کے نتائج وعواقب کے متعلق فرمایا

لھم من فوقھم ظلل من النار ومن تحتھم ظلل ذالك یخوف اللہ بہ عبادہ یعباد فاتقون (۳۹/۱۶)۔

ان کے اوپر سے بھی آگ کی ایک تہ ہوگی اور نیچے سے بھی (اس طرح وہ آگ کے اندر لپٹے ہوئے ہونگے) یہ وہ (عذاب) ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ (اور کہتا ہے کہ) اے میرے بندو! صرف میری حفاظت میں رہو۔

اس سے اگلی آیت میں ''عبادہ'' (اللہ کے بندوں) کی تشریح ان الفاظ میں فرمادی کہ

والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوھا وانا بوا الی اللہ لھم البشری۔ فبشر عباد (۳۹/۱۷)۔

اور وہ لوگ جو طاغوت (ہر غیر خدائی نظام) کی محکومیت سے اجتناب کرتے ہیں اور اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کے لئے بشارت ہے۔ سو میرے بندوں کو بشارت دے دیجئے۔

اوپر اور نیچے سے آگ کا عذاب نتیجہ ہے اس آئین حیات کا جو غیر خدائی نظام پر مبنی ہو۔ پھر جہنم ان لوگوں کا بھی ٹھکانہ ہے جو خدا کی نعمتوں کا کفران کرتے ہیں۔ شکر نعمت اور کفران نعمت خود مستقل موضوع ہیں اور ضمنی طور پر ان کے متعلق تفصیلاً گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ لیکن اجمالاً یوں سمجھئے کہ شکر کے معنیٰ یہ ہیں کہ جو چیز جس غرض کے لئے عطا کی گئی تھی اسے اسی مصرف میں استعمال کیا جائے۔ اگر اسے اس کے متعینہ مقصد کے خلاف استعمال کیا جائے تو یہ کفران نعمت ہوگا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے قوت عطا فرمائی ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کا مقصد ومصرف بھی متعین کر دیا ہے کہ قوت' مظلوم کے لئے سپر اور ظالم کے لئے شمشیر برہنہ کے طور پر استعمال کی جائے گی۔ اگر قوت کے مصرف یہی مقامات ہیں تو یہ اس کا شکر ہے۔ اگر استعمال اس کے خلاف ہے تو یہ کفران نعمت ہے اور کفران نعمت کا فطری نتیجہ آگ کا عذاب ہے۔ ذرا مادہ پرست اور خدا فراموش مذہب کے آئین حیات اور دستور زندگی پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ انہوں نے اللہ کی عطا فرمودہ نعمتوں سے کس درجہ کفران برت رکھا تھا۔ اللہ نے انہیں علم و عقل' دولت اور قوت' شوکت وحشمت سے بہرۂ وافر عطا فرمایا۔ لیکن انہوں نے مبدأ فیض کی ان کرم گستریوں کو کن مقاصد واغراض کے لئے صرف کیا ہے۔ ایک دنیا جانتی ہے! نتیجہ ظاہر تھا۔

الم تر الی الذین بدلوا نعمۃ اللہ کفرا واحلوا قومھم دارالبوار ۝ (۱۴/۲۸)۔

کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی جنہیں اللہ نے نعمت عطا فرمائی تھی مگر انہوں نے اسے کفران نعمت سے بدل دیا اور (اس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ) انہوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں جا اتارا۔ یعنی دوزخ میں جا اتارا۔ جس میں وہ داخل ہونگے۔ اور وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے۔

غور فرمائیے کفران نعمت کرنے والے خود ہی آگ کے عذاب میں مبتلا نہیں ہوتے بلکہ اپنی قوم کی قوم کو ہلاکت کے گھر میں جا اتارتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بات کا فیصلہ قوم کے اکابر و اراکین۔ مفکرین و مدبرین۔ ارباب حل وعقد ہی کرتے ہیں کہ اللہ کی نعمتوں یعنی قوم کی دولت اور قوت۔ سعی وعمل کے نتائج۔ علم اور سائنس کے ماحصل کو کن اغراض و مقاصد میں صرف کیا جائے گا۔ یہ مفکرین و مدبرین اگر متاع قومی کو ان مقاصد میں صرف کریں جو اللہ تعالیٰ کے قوانین نے متعین کئے ہیں اور یوں شکر نعمت کا عملی ثبوت دیں تو خود بھی سکون وطمانیت کی جنت میں رہیں اور قوم کو بھی امن وعافیت کے بہشت میں رکھیں۔ اگر ان ارباب بست وکشاد نے ان قوتوں کو غلط راستے میں صرف کرنا شروع کر دیا تو اس کفران نعمت کا نتیجہ ساری قوم کے لئے آگ کا عذاب ہے۔

خدا کی دی ہوئی قوتوں اور نعمتوں کو صحیح مقاصد میں صرف کرنے کا جذبہ محرکہ خدا پر ایمان اور مکافات عمل کے اٹل اصول پر محکم یقین ہی ہوسکتا ہے۔ یعنی سب سے پہلے یہ کہ مقاصد وہی صحیح اور حق بجانب ہوسکتے ہیں جو تمام نوع انسان کے پروردگار اور مشترک مالک اور آفاقانے ہر انسان کے تحفظ وارتقاء کے لئے معین فرمائے ہیں۔ انسان کے اپنے معین کردہ مقاصد عالمگیر منافع اور شرف انسانیت کے ترفع کے لئے نہیں ہو سکتے' دوسرے یہ کہ زندگی اس دنیا کی چار دیواری تک محدود نہیں بلکہ اس کے بعد بھی زندگی ہے جس میں ہر عمل کا فطری نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا اس لئے اگر آج کوئی فرد یا کوئی قوم اپنی دولت وقوت کی بناء پر غلبہ واستیلاء حاصل کئے جا رہی ہے اور یوں اپنے استبداد وتغلب سے انسانیت کی ہڈیاں کچل رہی ہے۔ تو اسے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ کوئی ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے! بلکہ انہیں اس پر ایمان ہونا چاہئے کہ ان کی ایک ایک حرکت ایک نتیجہ پیدا کر رہی ہے اور ان نتائج کا مجموعی اثر ان کے سامنے آ کر رہے گا۔ خواہ اس دنیا میں یا اس کے بعد۔ اگر کسی قوم نے ان بنیادی اصولوں سے انحراف کیا تو اس کا لازمی نتیجہ آگ کا عذاب ہے۔

اولئك الذين كفروا بايات ربهم ولقائه فحبطت اعمالهم فلا نقيم لهم يوم القيمة وزنا ٥ ذالك جزاء هم جهنم بما كفروا واتخذوا اٰياتى ورسلى هزوا ٥ (۱۰۶-۱۰۵/۱۸)۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی نشانیوں سے اور اس کے حضور حاضر ہونے سے منکر ہوئے پس ان کے سارے کام اکارت گئے اور اس لئے قیامت کے دن ہم ان کے اعمال کا کوئی وزن تسلیم نہیں کریں گے۔ انہوں نے جیسی کچھ کفر کی راہ اختیار کی تھی..... ہماری آیتوں کی ہنسی اڑائی تھی تو عذاب دوزخ اس کا (لازمی) نتیجہ ہے۔

حیات اخروی کے عقیدہ سے انکار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس دنیا کی طبعی زندگی کو عین حیات سمجھ لیتا ہے۔ حالانکہ طبعی زندگی تو محض حیوانی زندگی ہے۔ انسانیت تو اس سے آگے جا کر شروع ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ زندگی کے مقاصد بھی محض حیوانی ضروریات پورا کرنا رہ جاتے ہیں۔ تہذیب مغرب کے ''قصر مزین'' کے تمام اجزائے ترکیبی کو الگ الگ کر کے دیکھتے جایئے۔ ہر ایک کا ماحصل محض حیوانی اقتضاآت کی تسکین ہوگا۔ اس سے آگے شرف انسانیت کی پرورش کا کوئی سامان نہ ہوگا۔ اس نہج زندگی کا لازمی نتیجہ آگ کا عذاب ہے۔

والذين كفروا يتمتعون ويأكلون كما تأكل الانعام والنار مثوىً لهم ٥ (۱۲/۴۷)۔

اور جن لوگوں نے انکار کیا (تو ان کی زندگی یہ ہے کہ) وہ (دنیاوی متاع سے) فائدہ حاصل کرتے ہیں اور حیوانوں کی طرح کھاتے پیتے ہیں۔ ان کے رہنے کی جگہ آگ ہے۔

جب زندگی کا مقصد ہی ''کھاؤ' پیو اور خوش رہو'' قرار پا گیا تو پھر حقوق وفرائض کی نگہداشت کیسی اور بلند ومقدس جذبات کا تصور کہاں! فسق وفجور کی زندگی۔ انفرادی واجتماعی جرائم۔ ظلم وغارت گری۔ یہ سب تہذیب کے اجزاء اور تمدن کے عناصر قرار پا جاتے ہیں۔ یہ وہ غیر فطری اعمال ہیں جن کا لازمی نتیجہ آگ کا عذاب ہے چنانچہ مجرمین کے متعلق فرمایا:-

انه من یأت ربہ مجرما فان لہ جھنم لا یموت فیھا ولا یحییٰ o (۲۰/۷۴)۔

کچھ شک نہیں کہ جو شخص اپنے رب کے حضور مجرم ہو کر حاضر ہوگا تو یقیناً اس کے لئے جہنم ہوگی۔ نہ تو اس میں مرے گا نہ زندہ رہے گا۔

اسی طرح وہ ظالمین جن کے رفیع المنزلت کاشانوں کی رنگینی غریبوں اور ناداروں کے خون کی رہین منت ہوتی ہے ان کے متعلق فرمایا کہ ان سے کہا جائے گا کہ

فادخلوا ابواب جھنم خلدین فیھا فبئس مثوی المتکبرین o (۱۶/۲۹)۔

پس اب تمہارے لئے یہی ہے کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔ تمہیں ہمیشہ کے لئے اسی میں رہنا ہے۔ تو دیکھو تکبر کرنے والوں کا کیا ہی برا انجام ہوا۔

ظلم اور تکبر کا انجام ہلاکت اور تباہی کے برباد کن عذاب اور جہنم کے شعلوں کے سوا اور کیا ہوگا۔ اسی طرح فاسقین کے متعلق فرمایا:

واما الذین فسقوا فمأوٰھم النار کلما ارادوا ان یخرجوا منھا اعیدوا فیھا وقیل لھم ذوقوا عذاب النار الذی کنتم بہٖ تکذبون o (۳۲/۲۰)۔

اور وہ لوگ جنہوں نے حدود خداوندی کو توڑ ڈالا۔ سو ان کے رہنے کی جگہ آگ ہے۔ جب وہ اس سے نکلنے کا ارادہ کریں گے تو انہیں پھر اسی میں دھکیل دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ آگ کے اس عذاب کا مزہ چکھو جسے تم جھٹلاتے تھے۔

پھر دنیا کی مختلف قوموں پر نگاہ ڈالئے۔ کچھ قومیں غلبہ اور قوت میں بہت آگے ہوتی ہیں اور کچھ قومیں کمزور اور ضعیف۔ زبردست قومیں ان زیر دست قوموں کو اپنا محکوم رکھتی ہیں اور دنیائے معاملات اور بساط سیاست پر محکوموں کے فیصلے بالادست قوم کے فیصلوں کے تابع ہوتے ہیں۔ محکوم اقوام کے پاس اپنی حفاظت کے لئے کچھ سامان نہیں ہوتا۔ وہ اپنی حفاظت و مدافعت کے لئے بالادست اقوام کی قوت و سامان کی محتاج ہوتی ہیں۔ دنیا میں حرب وضرب کے فیصلے تو بالادست اقوام ہی کرتی ہیں۔ لیکن زیر دست اقوام ان کے فیصلوں کے تابع ہونے کی وجہ سے ان شعلہ فشانیوں سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتیں۔ جب آگ کا عذاب چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے تو زیر دست اقوام' بالادست اقوام کو پکارتی ہیں کہ اس مصیبت کو ان سے رفع کریں۔ لیکن اس وقت کمزور اور قوی دونوں بے بس ہوتے ہیں۔ اللہ کا عذاب نہ کسی کے روکے رک سکتا نہ کسی کے ٹالے ٹل سکتا ہے۔

واذیتحاجون فی النار فیقول الفعفٰؤا للذین استکبروا انا کنالکم تبعاً فھل انتم مغنون عنا نصیباً من النار o قال الذین استکبروا انا کل فیھا ان اللہ قد حکم بین العباد o (۴۰/۴۷۔۴۸)۔

جب آگ کے عذاب میں وہ ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو اس وقت کمزور لوگ ان سے کہیں گے جو (طاقت کے بل پر) تکبر کرتے تھے کہ ہم تو یقیناً تمہارے تابع تھے تو کیا تم اس عذاب نار کا کچھ حصہ ہم سے ہٹاؤ گے نہیں؟

جو لوگ تکبر کرتے تھے وہ کہیں گے کہ ہم تو سب ہی اس عذاب کے اندر ہیں۔ یقیناً اللہ نے بندوں میں فیصلہ کر دیا ہے۔

دوسرے مقامات پر بھی ان جماعتوں کے باہمی جھگڑوں کا ذکر ہے۔ یعنی وہ جماعتیں جو اس ہلاکت کے آتشین عذاب کو چھیڑتی ہیں اور (ان کے بعد) وہ جماعتیں جنہیں ان کی اتباع میں بلا اختیار و ارادہ اس ہلاکت کے گڑھے میں کودنا پڑتا ہے۔ سورہ ص میں عذاب نار کے ذکر میں ہے:

ھٰذا فوج مقتحم معکم لا مرحباً بھم انھم صالوا النار o قالوا بل انتم لا مرحبا

بکم انتم قد متموہ لنا فبئس القرار o قالوا ربنا من قدم لنا ھذا فزدہ عذاباً ضعفاً فی النار o (۳۸/۵۹-۶۱)۔

یہ ایک جماعت اور آئی جو تمہارے ساتھ (عذاب میں شریک ہونے کے لئے) آنکھیں بند کر کے کود رہے ہیں۔ان پر خدا کی مار ہو۔یہ بھی دوزخ میں چلے آ رہے ہیں۔وہ (اگلوں سے) کہیں گے کہ خدا کی مار تمہارے اوپر ہو۔کیونکہ تم ہی نے تو اس مصیبت کو ہمارے لئے تیار کیا ہے جو بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔وہ (پیچھے آنے والے) کہیں گے۔اے ہمارے پروردگار! جس نے اس عذاب کو ہمارے لئے تیار کیا ہے اسے آگ کا دگنا عذاب دینا۔

جب آگ کا عذاب چاروں طرف سے مسلط ہو جائے گا تو ہر شخص اعتراف کرے گا کہ فی الواقع یہ ان کے جرائم کا فطری نتیجہ ہے۔اس وقت انہیں احساس ہوگا کہ وہ نظام جو غیر خدائی قوانین کی بناء پر مرتب کیا گیا تھا کس قدر ہلاکت آفریں تھا۔اس وقت چاروں طرف سے ایک جدید نظام کی آوازیں بلند ہونگی۔ہر ایک کی آواز ہوگی کہ اس عذاب سے نجات کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ہر طرف سے پکار ہوگی کہ

فاعترفنا بذنوبنا فھل الیٰ خروج من سبیل۔ (۴۰/۱۱)۔

ہم اپنے جرائم کا اعتراف کرتے ہیں۔سو اس (عذاب) سے نکلنے کی کوئی راہ بھی ہے؟

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس عذاب نار کی طرف روانگی اور اس میں داخلہ کس انداز سے ہوگا۔دھوئیں کے بادلوں کے سائے میں (ظل من یحموم ۵۶/۴۳) طوق و زنجیر میں جکڑے ہوئے (ثم فی سلسلۃ ذرعھا سبعون ذراعاً فاسلکوہ ۶۹/۳۲) آگ کے شعلوں کی لپٹ سے منہ جھلسے ہوئے۔چہرے بگڑے ہوئے (تلفح وجوھھم النار وھم فیھا کالحون o ۲۳/۱۰۳) آگ کے عذاب کی طرف دھکیلے جائیں گے (یوم یدعون الیٰ نار جھنم دعاً ۵۲/۱۳) اور سامنے سے بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے بڑے بڑے محلات جتنے پھیلاؤ میں اور اس انداز سے کہ گویا زرد رنگ کے اونٹ قطار در قطار کھڑے ہیں (انھا ترمی بشرر کالقصر o کانہ جملت صفر ۳۳-۳۲/۷۷) یہ ہوگا وہ آتشیں عذاب جس کی طرف مجرمین کشاں کشاں پابجولاں گھسٹتے چلے جائیں گے۔چیختے چلاتے۔مدد کو پکارتے۔لیکن اس دن نہ ان کا کوئی یار و مددگار ہوگا نہ رفیق اور دوست' جو انہیں اس عذاب ہلاکت انگیز سے نجات دلا سکے کہ یہ عذاب تو ان کے اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا ہے۔

حیات اخروی کے جہنم کے متعلق انسانوں کو سمجھانے کے لئے انسانوں ہی کی زبان میں بیان کیا جا سکتا تھا لیکن اس عذاب کی حقیقت اور ماہیت کیا ہے۔آج کوئی دماغ اس کا تصور اور کوئی قلب اس کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا۔یہ تو وہیں جا کر معلوم ہوگا لیکن خود اس دنیا میں انسان اپنے غیر فطری نظام زندگی کے طفیل آگ کے جس عذاب میں آج مبتلا ہے دیکھئے کہ اخروی عذاب النار کا تمثیلی بیان اس پر بھی کس طرح منطبق ہو رہا ہے۔زمین سے آگ۔آسمان سے آگ۔دائیں اور بائیں آگ۔ہوا میں آگ۔پانی میں آگ۔غرضیکہ ہر مکان میں آگ (ہر مکین کے دل میں آگ) اوپر اور نیچے آگ کے پردے۔چیخ اور پکار۔نالہ و شیون۔آہ و بکا۔زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسان۔کشاں کشاں آگ کے شعلوں کی طرف دھکیلے چلے جا رہے ہیں۔ہر شخص تڑپ رہا ہے کہ اس عذاب سے نکل بھاگنے کی کوئی صورت ہو۔لیکن بے بسی کا یہ عالم کہ ہر شخص اپنی تمناؤں کے باوجود پھر آگ کے گڑھوں کی طرف جانے پر مجبور ہے۔قوموں کی قومیں۔کوئی بالارادہ۔کوئی بلا ارادہ اس آگ میں جھلسے جانے کے لئے دہکتے ہوئے انگاروں میں کودتی چلی جا رہی ہیں۔کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہو کیا رہا ہے؟ اور اس سے بچا کیسے جا سکتا ہے!! دھوئیں کے سیاہ بادل (Screen Smoke) چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔سو سو میل کی مسافت سے تیل کے ذخیروں کے بھڑکتے

ہوئے شعلے دکھائی دے رہے ہیں۔ ہلاکت اور بربادی کے سفاک عفریت ہر طرف فضا میں منڈلا رہے ہیں۔ تباہی اور خوں ریزی کے شیاطین کی زنجیریں کٹ چکی ہیں اور وہ پورے کے پورے صفحۂ ارض پر انسانوں کی لاشوں کو روندتے پھاندتے آگ اور خون کی ہولی کھیلنے میں مصروف ہیں۔ کسی گوشے میں امن نہیں۔ کوئی کونہ محفوظ نہیں اور یہ سب اس لئے کہ انسانوں نے خدا کو بھلا دیا اور انسانیت کو قوانین خداوندی کی بجائے خود ساختہ آئین و دستور کے قالب میں ڈھالنے پر مجبور کر دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ آگ کا عذاب تھا اور یہ عذاب تو اس آنے والے عذاب کے مقابلے میں کچھ حقیقت ہی نہیں رکھتا۔ یہ عذاب مسلط اس لئے کیا جاتا ہے کہ شاید انسان اس سے عبرت حاصل کرے اور اپنے آپ کو نظام خداوندی کے تحت لا کر اس بڑے عذاب کی ہلاکت سے بچ جائے۔

ولنذیقنھم من العذاب الادنیٰ دون العذاب الاکبر لعلھم یرجعون ۝ (۳۲/۲۱)۔

ہم یقیناً انہیں عذاب اکبر (بڑے عذاب) سے ورے۔ ادنیٰ (قریبی) عذاب چکھائیں گے۔ تاکہ شاید یہ لوگ (حقیقت کی طرف) رجوع کر لیں۔

شاید انسان اس عالمگیر عذاب سے عبرت حاصل کر کے اپنی روش زندگی کو فطرت کے صحیح قوانین (کتاب اللہ) کے تابع رکھ لے۔ اگر اس نے ایسا کر لیا تو سمجھئے کہ اس نقصان کے مقابلہ میں فائدہ زیادہ ہے۔ لیکن اتالیقِ فطرت کی اس سرزنش اور گوشمالی کے باوجود اگر اس نے حقیقت کی طرف آنے سے اعراض برتا تو سمجھ لے کہ قوانینِ الٰہیہ کے انتقام کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔

ومن اظلم ممن ذکر بایٰات ربہٖ ثم اعرض عنھا انا من المجرمین منتقمون ۝ (۳۲/۲۲)۔

اور اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جسے خدا کی نشانیوں کی یاددہانی کرائی جائے۔ لیکن اس کے بعد وہ ان سے پہلوتہی کر لے یقیناً (ہمارا قانون مکافاتِ عمل) مجرمین سے انتقام لے کر رہے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆